شاداب علیم
نظمِ جدید کی تثلیث
قلق میرٹھی
اسماعیل میرٹھی
رنج میرٹھی

نظم جدید کے میر کارواں کے طور پر محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے نام سے آج اردو ادب کا ہر طالب علم بخوبی واقف ہے۔ نظم جدید کے فروغ کی ابتدا انجمن تحریک پنجاب کے جس تاریخ ساز مشاعرے سے ہوتی ہے اس کا انعقاد محمد حسین آزاد کی کاوشوں سے ۹ را پریل ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ یہ روداد ہماری اردو تنقید میں عام ہے۔ لیکن میرٹھ میں نظم جدید کی اساس بہت پہلے ہی رکھی جا چکی تھی۔ قلق میرٹھی نے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کر کے نظم جدید کے لئے فضا ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا، جس پر اسماعیل میرٹھی نے عمل کرتے ہوئے نظم جدید کے ارتقا میں نئے باب رقم کئے۔

شاداب علیم شعبہ اردو کی ایک ذہین طالبہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "نظم جدید کی تثلیث" قلق، رنج اور اسماعیل میرٹھی میں نظم جدید کے فروغ پر کھل کر بحث کی ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ میرٹھ سے ہی نظم جدید کو فروغ حاصل ہوا۔

شاداب علیم کی یہ پہلی کوشش ہے جو شعبہ اردو کے اشاعتی سلسلے کی پہلی کتاب کی شکل میں پیش ہے۔ شاداب کا ادبی سفر ابھی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اردو ادب میں جلد اپنی شناخت قائم کر لیں گی۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

شاداب علیم نے میرٹھ کے تناور ادبی درخت کی تین شاخیں قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی پر عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ اپنی پہلی کتاب "نظم جدید کی تثلیث" میں ہی انہوں نے ان تینوں قد آور شخصیات کے احوال و کوائف اور ان کی

نظمِ جدید کی تثلیث

شاداب علیم

NAZM-E-JADEED KI TASLEES

BY

Shadab Aleem

Year : 2005

Rs.: 150.00

نظمِ جدید کی تثلیث

شاداب علیم

پبلشر و تقسیم کار

شعبہء اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ250005

Published by : Department of Urdu
Ch. Charan Singh University, Meerut-250005
Phone: 0121-2450532, 2774562, 09412207277
email : aslamjamshedpuri@yahoo.com

مصنف: شاداب علیم

302/20 نادر علی بلڈنگ، دہلی روڈ، میرٹھ 25001

فون: 0121-2423980

سن اشاعت: 2005

تعداد اشاعت: 500

قیمت: Rs.150.00

کمپوزنگ، سرورق و مطبع: 3Z انٹر پرائزز (پبلشنگ ہاؤس)، میرٹھ

Published by : Department of Urdu
Ch. Charan Singh University, Meerut-250005

ملنے کا پتہ:

- شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ممبئی، علی گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

انتساب

شریکِ حیات

جناب سید اطہرالدین

کے نام

جن کی رہنمائی کے بغیر

''کچن سے کیمپس'' تک کا سفر ممکن نہ تھا!

اس کتاب میں

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

سرزمینِ میرٹھ کوکئی اعتبار سے امتیاز حاصل ہے۔ جدوجہد آزادی میں مادرِ وطن کے لئے جاں نثاروں کی بات ہو یا آسمانِ سیاست پر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی یا پھر سماجی، علمی، لسانی اور ادبی شعبوں میں تحقیقی وتنقیدی کارناموں کا ذکر ہو، ہر جگہ اہلِ میرٹھ کی گراں قدر خدمات سے ہندوستان کا سرِ افتخار بلند ہوتا آیا ہے۔ میرٹھ کو ماضی بعید سے لے کر آج کی اس تیز رفتار زندگی میں بھی یہاں کے ادباء و شعراء نے جس دیدہ ریزی اور جاں کاہی سے اردو شعروادب کی زمین کی ضیاء پاشی اپنی بصیرتوں اور بشارتوں سے کی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ایک الگ موضوع بحث ہے کہ بعض ادباء و شعراء کی قدر و قیمت کے تعین میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ غالبؔ اور مومنؔ کا زمانہ ہو یا مولانا محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ کا یا بیسویں صدی کا، ہر دور میں یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے اردو حلقے کو اپنی نثر و نظم سے مسحور کیا ہے۔ شاعری کی دنیا میں یہاں جن تین عظیم المرتبت شعراء قلقؔ میرٹھی، برجِ

میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی نے میرٹھ کے نام کو سر بلندی عطا کی ہے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ادبی کاوشوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ زیرِ نظر کتاب میں ہمارے شعبۂ اردو کی ایم فل کی ذہین طالبہ شاداب علیم نے بڑی محنت اور لگن سے پیش کیا ہے۔

یوں تو ان تینوں اہم شاعروں کی حیات وخدمات پر اور بھی تحقیقی وتنقیدی کام ہو چکے ہیں لیکن شاداب علیم کی یہ کوشش ان معنوں میں انفرادیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ انہوں نے قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی کی نظمِ جدید کی راہ میں ادبی کاوشوں کا ایک ایسا سنگم پیش کیا ہے۔ جس سے نظمِ جدید کے آغاز وارتقا میں میرٹھ کے شعرا کے صحیح مقام کا تعین ہوتا ہے۔ شاداب علیم کی یہ کاوش معروضی اور موضوعی اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے۔

مذکورہ شعراء کے مقام اور ان کی قدر ومنزلت کے سلسلے میں شاداب علیم نے نہ صرف ایمانداری اور غیر جانبداری کا ثبوت پیش کیا ہے بلکہ ان کی ادبی خدمات کے ان گوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے جو ادب نوازوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ شاداب علیم نے ان شعرا کے کلام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر کچھ نئی جہات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔

قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی انفرادی طور پر تاریخ ساز اہمیت کے حامل ہیں۔ رنج میرٹھی ایک غزل گو اور نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی قطعات کہنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن ان کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ وہ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے شاعرات کا تذکرہ تحریر کیا۔ اس سے قبل کے تذکروں میں

شاعرات کا ذکر گاہے گاہے مل جاتا ہے لیکن رنجؔ نے اپنی محنت وکاوش سے شاعرات کا تذکرہ مرتب کیا۔ بعدازاں اسی ڈگر پر چل کر متعدد تذکرہ نگاروں نے شاعراتِ ہند کے تذکرات کی تالیف وترتیب کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ رنجؔ نے انجمنِ تحریکِ پنجاب کے مشاعروں میں شرکت بھی کی اور نظمِ جدید کی راہ پر اپنے قدم ثبت کئے۔

فلقؔ میرٹھی مدتوں تک حاشیے پر رہے ان کے کلام کو کلاسیکی شعرا پر کام کرنے والوں نے اجاگر کیا ورنہ اس سے قبل وہ گمنام ہی تھے۔ فلقؔ میرٹھی مومنؔ کے شاگرد اور غزل گو شاعر تھے۔ دلّی کی شعری وادبی محفلوں میں وہ انفرادی مقام کے حامل تھے۔ وہ عمدہ نثر نگار بھی تھے جس کا ثبوت غالبؔ جیسے عظیم المرتبت شخصیت کے مکاتیب ''عودِ ہندی'' پر ان کی تقریظ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دیوان مومنؔ اور حکیم فصیح الدین رنجؔ کے شاعرات کے تذکرے ''بہارستانِ ناز'' پر تقریظات تحریر کیں۔ اس سے ان کے ادبی مرتبے کی نشاندہی ہوتی ہے لیکن شاداب علیم نے ان کی ادبی کاوشوں کے جس پہلو کو خصوصیت کے ساتھ ابھارا ہے وہ ان کے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ فلقؔ میرٹھی نے بعض حکامانِ وقت کی فرمائش پر ۱۵ / انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو ''جواہر منظوم'' کے نام سے ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ پریس الہ آباد سے طبع ہوا۔ اس سے قبل غالبؔ نے اس پر نظرثانی بھی کی تھی۔ 'جواہر منظوم' کو اردو منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیا گیا ہے۔ فلقؔ کا یہ قدم درحقیقت نظمِ جدید کی شاہراہ پر پہلا قدم تھا جس نے انگریزی ادب خصوصاً انگریزی نظموں کے تراجم کے دروازے کھول دئے اور اس طرح محمد حسین آزادؔ، حالیؔ ودیگر شعرا نے انگریزی شاعری سے استفادہ کرتے

ہوئے جدید نظم نگاری کے لئے اجتماعی طور پر شعوری کوشش کی جس کا آغاز ۱۸۷۴ء میں مشاعروں میں موضوعاتی نظموں سے ہوا۔

اسماعیل میرٹھی کے نام نامی سے طلباء بخوبی واقف ہیں کیونکہ ان کی نصابی کتب نے ہزاروں طلباء کو نہ صرف اردو سے روشناس کرایا بلکہ شعروادب کے رموز ونکات سے آگاہ بھی کیا۔ لیکن ان کی اس کاوش نے ایک غلط فہمی کو بھی جنم دیا وہ یہ کہ اسماعیل میرٹھی کو محض بچوں کے شاعر کے لقب سے نوازا گیا۔ جب کہ ان کی ادبی خدمات ہمہ جہت ہیں۔ ان کا وہ کارنامہ جو حقیقتاً ان کو دنیائے نظم میں ایک عظیم مقام عطا کرتا ہے۔ نظمِ جدید کے آغاز وارتقا میں ان کی کاوشِ پیہم ہے۔ قلق کے تراجم نے ان کو انگریزی شاعری کی راہ دکھائی جس سے انہوں نے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ شاداب علیم نے بجا طور پر ان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے نظمِ جدید کے لئے مسدس فارم کا استعمال کیا جب کہ اسماعیل میرٹھی نے نظمِ جدید کے لئے نہ صرف مسدس بلکہ مثلث، مربع، مخمس اور مثمن کا بھی استعمال کیا۔ اس طرح یقیناً وہ آزاد و حالی سے اس راہ میں کئی قدم آگے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے مختلف اصناف میں ہیت کے تجربے بھی کئے۔ انہوں نے نظمِ معریٰ بھی تحریر کیں، جن میں انہوں نے 'مصرع مسلسل' کا استعمال کیا۔ جس کا استعمال اس سے قبل اردو میں کہیں نہیں ملتا۔ کافی عرصے بعد حلقہ ارباب ذوق کے شعرا نے نظمِ معریٰ میں نئے نئے تجربات کئے۔

اس طرح رنج، قلق اور اسماعیل میرٹھی کی ادبی کاوشوں کے جائزے سے یہ

حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نظمِ جدید کے لئے ان تینوں حضرات نے شعوری و عملی طور پر اقدام کئے۔ نظمِ جدید کے میر کارواں کے طور پر محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے نام سے آج اردو ادب کا ہر طالب علم بخوبی واقف ہے۔ نظمِ جدید کے فروغ کی ابتدا انجمنِ تحریک پنجاب کے جس تاریخ ساز مشاعرے سے ہوتی ہے اس کا انعقاد محمد حسین آزاد کی کاوشوں سے ۹ راپریل ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ یہ روداد ہماری اردو تنقید میں عام ہے۔ لیکن میرٹھ میں نظمِ جدید کی اساس بہت پہلے ہی رکھی جا چکی تھی۔ قلق میرٹھی نے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کر کے نظمِ جدید کے لئے فضا ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا تھا، جس پر اسماعیل میرٹھی نے عمل کرتے ہوئے نظمِ جدید کے ارتقا میں نئے باب رقم کئے۔

شاداب علیم شعبۂ اردو کی ایک ذہین طالبہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "نظمِ جدید کی تثلیث" قلق، رنج اور اسماعیل میرٹھی میں نظمِ جدید کے فروغ پر کھل کر بحث کی ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ میرٹھ سے ہی نظمِ جدید کو فروغ حاصل ہوا۔

شاداب علیم نے قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی کی سوانح، ادبی خدمات اور نظمِ جدید کے فروغ میں ان کے کردار پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ نظمِ جدید کے آغاز میں ان کے مقام کے تعین کے علاوہ ان کی دیگر تاریخ ساز ادبی کاوشوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

شعبۂ اردو نے اشاعتی سلسلے کی شروعات کی ہے۔ باضابطہ کتابی صورت

میں ''نظمِ جدید کی تثلیث'' شعبہ اردو کی پہلی کتاب ہے۔ شعبہ اردو ایک ششماہی ادبی رسالہ ''ہماری آواز'' بھی باقاعدگی سے شائع کر رہا ہے۔

شاداب علیم کا ادبی سفر ابھی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اردو ادب میں جلد اپنی شناخت قائم کرلیں گی۔ میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

(ڈاکٹر اسلم جمشیدپوری)

کتاب سے پہلے

میرٹھ کی سرزمین، شعر وادب سے ہمیشہ سرسبز وشاداب رہی ہے اور یہاں کی زرخیز مٹی سے نثر و نظم کی فصل اگتی رہی ہے۔ کئی معتبر اور قابلِ افتخار شخصیات نے یہاں علم و ہنر کی جو تخم ریزی کی تھی اس کے پودے آج بھی ہرے بھرے نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاعروں، نثر نگاروں، تنقید نگاروں اور تذکرہ نگاروں کا جو ذہین طبقہ میرٹھ میں ایک زمانہ سے موجود تھا اس کی جڑیں ہنوز دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حقیقت اور جدت پسندی سے موجودہ عہد تک متعدد شعراء وادباء ایسے ہیں جو آسمانِ ادب پر ابدیت کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ جن شعراء وادباء نے میرٹھ کو عالمی سطح پر شہرت دلائی ان میں قلق میرٹھی، رنج میرٹھی، اسمٰعیل میرٹھی، بیاں میرٹھی اور حفیظ میرٹھی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کئی اور بھی پرانے اور نئے چراغ موجود ہیں جن سے شعر وادب کی شمع کو روشن ہے۔ اہلِ زبان ان کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میرٹھ کی ادبی فضا کے حوالے سے پہلے بھی بہت سے تحقیقی کام ہوئے

ہیں۔خود قلق میرٹھی، رنج میرٹھی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شخصیات اور حیات و خدمات پر کئی
کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں، تاہم ان تینوں بڑے تخلیق کاروں کو کسی ایک
تصنیف میں شامل کر کے ان کی انفرادیت کو اجاگر کرنا اور ان کی الگ الگ حیثیت اور
قدر و قیمت کا تعین کرنا ایک مشکل امر تھا۔لیکن اس مشکل کو آسان بنانے کا عزم و
حوصلہ ہی اس کتاب کی تحریر و اشاعت کا جواز بنا اور اس جواز کو عملی شکل دینے کے لئے
''چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ''میں شعبہء اردو کے قیام اور صدر شعبہ ڈاکٹر اسلم
جمشید پوری صاحب کی حوصلہ افزائی نے میرے قلب و جگر میں پنہاں شوقِ تعلیم کو
بیدار کر دیا۔اسی وجہ سے میں نے اپنے عزم و استقلال کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے
دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ہمت و محنت سے اپنی بساط بھر کام کرنا
شروع کیا تو مشکلیں آسان ہوتی چلی گئیں۔اس پورے تعمیری و تشکیلی دور میں مجھے جن
دو شخصیات نے حوصلہ دیا ان میں استاد محترم ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور میرے شریکِ
حیات جناب سیّد اطہر الدین کے نام بطورِ خاص شامل ہیں۔

استاد محترم کی نگرانی میں کام کرنے کا مجھے جب موقع ملا تو دیگر طلبا و طالبات
کے ساتھ ان کی شفقت کو قریب سے محسوس کیا۔نہ صرف میرٹھ بلکہ گرد و نواح میں جس
لگن اور محنت سے انھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے کام کیا اسی رفتار
سے اس تعمیری کام میں انہیں زبردست کامیابی بھی ملی۔مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اس
سعی جمیل میں دوسرے طلباء کے ساتھ میں بھی ان کے مشن میں شامل رہی۔اب
احساس ہوتا ہے کہ دراصل ان کی شفقت و محبت نے میری ہمت کو تقویت بخشی تو خار

دار راہوں سے گزرنا قدرے آسان ہوگیا۔ مشفق استادِ محترم جناب ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ شکریہ کے الفاظ سے ان کے بے کراں خلوص کی قدر دانی کہیں متاثر نہ ہوجائے۔

خانگی ذمہ داریوں کے باعث میری تعلیم جو ادھوری رہ گئی تھی اس کو تکمیل تک پہنچانے میں میرے شریکِ حیات جناب سیّد اطہر الدین نے اہم رول ادا کیا۔ شروع میں اپنی رہائش گاہ نادر علی بلڈنگ سے شعبۂ اردو تک کا جو تعلیمی سفر کشمیر سے کنیا کماری تک کے سفر کے مصداق لگتا تھا، ان کی بدولت ہی آسان ہوتا چلا گیا اور شادی کے بعد جو تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا تھا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں انہوں نے اس طرح ساتھ نبھایا کہ ''کچن سے کیمپس'' تک کا سفر ممکن ہوسکا۔

اس کتاب کے سلسلہ میں جن لوگوں نے ہر موڑ پر میری رہنمائی کی اور مواد کی فراہمی میں میرا ہاتھ بٹایا ان کا شکریہ ادا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتی ہوں۔ پدم شری جناب حکیم سیف الدین کی شخصیت بھی لائق تعریف ہے جنہوں نے اپنی لائبریری سے مجھے استفادہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اساتذہ میں ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی صاحب، ڈاکٹر کہکشاں لطیف صاحبہ، ڈاکٹر افشاں ملک صاحبہ، ڈاکٹر نیر جہاں صاحبہ اور ڈاکٹر فرحت خاتون صاحبہ کی کرم فرمائیوں اور نیک مشوروں کے لئے بھی سپاس گزار ہوں۔ علاوہ ازیں اپنے شفیق استاد جناب ڈاکٹر مشتاق صدف صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اس مسوّدہ کو لوح سے تمت تک پڑھا اور جگہ جگہ اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے اصلاح بھی فرمائی۔ اس التفات خاص کے

صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مسودہ کو لوح سے تمت تک پڑھا اور جگہ جگہ اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے اصلاح بھی فرمائی۔ اس التفات خاص کے لئے میں ان کی بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ ساتھ ہی میں جناب ظفر گلزار صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی کوشش کے باعث ہی کتاب کی کمپوزنگ، پروسنگ اور پرنٹنگ کی ہزار پریشانیوں سے مجھے نجات ملی۔

مجھے پوری طرح یقین ہے کہ میں اپنے والدین اور اپنی خوشدامن کی دعائے نیم شبی اور شفقتوں کے باعث ہی اس منزل تک پہنچ سکی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرے تعلیمی و ادبی سفر میں مستقبل میں بھی ان کی دعائیں میرے سر پر سایہ رکھیں گی۔ یہ میری پہلی کاوش ہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ آپ کو اتفاق و اختلاف کی پوری آزادی ہے۔ مجھے آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

شاداب علیم

باب اول

ابتدائیہ

میرٹھ ایک ایسا نام ہے جو ذہن میں آتے ہی انقلاب کے تصور کو زندگی بخشتا ہے۔ میرٹھ وہ شہر ہے جس کے جانبازوں نے پہلی مرتبہ انگریزی استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ میرٹھ ایک تاریخی شہر ہے جس کے ساتھ حریت انقلاب اور تیغ وتلوار کا تصور ہی ذہن میں آتا ہے۔ لیکن اپنے ایم اے کے تیسرے سمسٹر کے دوران میں میرٹھ کے ایک اور انقلابی تصور سے روشناس ہوئی اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ یہ انقلاب تیر وتفنگ کا انقلاب نہ تھا۔ تیغ وتلوار کا انقلاب نہ تھا، بندوق وبارود کا انقلاب نہ تھا اس انقلاب میں نہ زخمیوں کی کراہ تھی، نہ معصوموں کی چیخیں، نہ بیواؤں کے بین تھے، نہ بلکتے بچوں کی دلخراش آوازیں، نہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ تھی، نہ توپوں کی گرج تھی، نہ جلتے گھر تھے، نہ ویران گاؤں وشہر، یہ انقلاب ایک ادبی انقلاب تھا اور اس انقلاب کے ہیرو تھے غلام مولیٰ بخش قلق میرٹھی، مولانا اسماعیل میرٹھی اور حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی۔

جدید نظم کے ارتقاء اور انجمن تحریک پنجاب کے مطالعہ کے دوران میں نے پڑھا کہ جدید نظم دراصل مولانا محمد حسین آزاد کی شعوری سعی جمیلہ کا نتیجہ ہے جس کا آغاز انہوں نے ۹/اپریل ۱۸۷۴ء کے تاریخ ساز مشاعرے کے ذریعہ لاہور میں کیا۔ ایک سال تک مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا اور ان مشاعروں میں غزلوں کی جگہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں جن کے موضوعات پہلے ہی مقرر کردئے جاتے تھے۔ ان مشاعروں اور انجمن پنجاب کو ایک علم پرست کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس طرح کے ۹ مشاعروں کے انعقاد کی تفصیل موجود ہے۔ محمد حسین آزاد کی اولیت کو مزید سات سال تک لے جایا جاسکتا ہے، جب اگست ۱۸۶۷ء کے ایک جلسے میں انہوں نے "خیالات درباب نظم اور کلام موزوں" کے موضوع پر ایک مفصل تقریر کی تھی جو بعد میں 'مجموعہ نظم آزاد' میں شائع ہوئی۔ جدید نظم کی تحریک کے سلسلے میں حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی اور مولانا اسماعیل میرٹھی کا ذکر بھی سطحی طور پر کیا گیا ہے۔

شعبہ اردو کے مجلّے "ہماری آواز" کے دوسرے شمارے کے خصوصی گوشہ کے لئے مولانا اسماعیل میرٹھی کے نام نامی کا انتخاب کیا گیا۔ اس لئے مدیر کی حیثیت سے اسماعیل میرٹھی کی شخصیت اور انکی ادبی کاوشوں کے مختلف گوشوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑی اور تب پہلی بار اس حقیقت کا علم ہوا کہ درحقیقت انجمن پنجاب اور اس کے "مناظموں" سے تقریباً دس سال قبل میرٹھ کے دو مایہ ناز فرزند غلام مولیٰ بخش قلق میرٹھی، اور مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نظم جدید کی راہ پر اپنے قدم ثبت کر چکے تھے۔

قلق میرٹھی جو مومن خان مومن کے تلامذہ میں سے تھے ۱۸۶۰ء میں میرٹھ میں محکمہ سررشتہ تعلیم سے منسلک تھے۔ قلق انگریزی پڑھے لکھے تھے اس لئے ان کو انگریزی کی اخلاقی نظموں کے منظوم ترجمے کا پروجیکٹ مسٹر ٹی جے کین انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ نے دیا۔ اس وقت افسرِ تعلیم جناب کیمسن تھے ان ہی کے حکم سے ٹی جے کین نے منظوم تراجم کرائے۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۴ء میں یعنی انجمن پنجاب کے مشاعروں سے دس سال قبل "جواہر منظوم" کے نام سے گورنمنٹ پریس الہٰ آباد سے طبع ہوا۔ اشاعت سے قبل مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اس پر نظر ثانی بھی کی تھی۔ فرانسیسی مصنف گارساں دتاسی نے بھی اپنے خطبات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

قلق میرٹھی کے حالات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ قلق کے ساتھ اسماعیل میرٹھی بھی سررشتہ تعلیم سے منسلک تھے یہیں سے دونوں کے درمیان مراسم اور روابط قائم ہوئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے صاحبزادے مولف ''حیات وکلیات اسماعیل'' کے مطابق مولانا اسماعیل میرٹھی کو اس ترجمے کو دیکھ کر استعجاب ہوا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں۔ اور ان تراجم سے متاثر ہو کر انہوں نے ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں چھ انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کیے یعنی انجمن پنجاب کے مشاعرے سے سات سال قبل اور جب محمد حسین آزاد اپنے ''خیالات درباب نظم موزوں'' جمع ہی کر رہے تھے یہ فرزندان میرٹھ اس راہ میں اپنے قدم ثبت کر چکے تھے اس طرح یقیناً میرٹھ ایک نئے انقلاب کی سرزمین بن گیا۔ یقیناً قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی اردو ادب میں ایک تاریخ ساز اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی کاوشوں سے

یہ علم ہوا کہ حلقۂ ارباب ذوق سے بہت پہلے مولانا اسماعیل میرٹھی نظم بے قافیہ یعنی نظم معرّیٰ کے تحت "چڑیا کے بچے" اور "تاروں بھری رات" لکھ چکے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے دوسری صنفوں میں بھی ہیئتی تبدیلیاں کی تھیں۔ بچوں کے لئے نظمیں کہیں اور نصابی کتابیں تالیف کیں ان کے یہ دونوں کارنامے بھی ان کو تاریخ ساز شخصیت بناتے ہیں۔

نظم جدید کے مطالعہ کے دوران حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی کا نام بھی سامنے آیا اور علم ہوا کہ انہوں نے پہلی مرتبہ شاعرات کا تذکرہ تالیف کیا اس سے قبل شعراء کے تذکرے تو موجود تھے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں یہ شاعرات کا پہلا تذکرہ تھا۔ اسی طرح فصیح الدین رنجؔ میرٹھی بھی ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔

مندرجہ بالا حقائق نے مجھے یہ مقالہ لکھنے کی تحریک دی۔ اس مقالہ میں ان عظیم شخصیات کی تاریخ ساز کاوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ ان کی دیگر کاوشوں کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی کاوشیں چونکہ کئی ادبی اصناف پر محیط ہیں اس لئے ان کے بارے میں مضمون زیادہ تفصیلات اور زیادہ جگہ کا متقاضی تھا لہٰذا مولانا اسماعیل میرٹھی پر مضمون زیادہ طویل ہے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب میں قلقؔ میرٹھی، رنجؔ میرٹھی اور اسماعیلؔ میرٹھی کی تثلیث ان معنوں میں زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کہ ایک ساتھ کئی چیزوں کو یکجا کر کے ان شعرا کی تاریخی و ادبی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ان شعرا کے حوالے سے

ماقبل جو کام ہوئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں مذکورہ شعرا کی شاعری اور ادبی خدمات کے اعتراف میں نئی تلاش وجستجو کے لئے مزید چھان پھٹک کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ نئے حقائق سے آشنائی اور پرانی غلط فہمیوں پر سے پردہ اٹھانے کے لئے جو تگ ودو کی گئی ہے اس میں کس حد تک کامیابی ملی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آخری بات یہ کہ قلق، رنج اور اسماعیل میرٹھی نہ صرف میرٹھ بلکہ اردو شعر وادب میں اپنا اہم مقام رکھتے ہیں اور ان کا قد بلند نظر آتا ہے

میرٹھ: تاریخی و ادبی پس منظر

انیسویں صدی کے وسط میں زندگی میں بنیادی تبدیلیاں عمل میں آ چکی تھیں۔ اس وقت معاشرے اور تہذیب ہی نہیں بلکہ ادب اور آگہی، جذبہ اور شعور کی سمت و رفتار بدل رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سے مسلمانوں کا جاہ و جلال ختم ہو گیا تھا وہ حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے انگریز پورے ملک میں اپنا تسلط قائم کر چکے تھے۔ زمام حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں آ چکی تھی اور حکومت برطانیہ ایک طویل دور حکومت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ملک کے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد ڈال رہی تھی۔ عجب اتفاق ہے کہ جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھنے والا تھا بڑے بڑے عالم و شاعر دہلی میں جمع تھے۔ امام بخش صہبائی، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، داغؔ دہلوی، ذوقؔ، مومن خاں مومنؔ، اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جیسے شاعر آسمان ادب پر چھائے ہوئے تھے اور انہیں کے دم سے دلّی کا یہ آخری دور یادگار بن گیا۔ حالانکہ جو حالات پیدا ہو گئے تھے اسے روکنے کی طاقت کسی میں نہ تھی ان شعراء نے

مغلیہ سلطنت کو دم توڑتے دیکھا یہ سیاسی نظام ہی کا خاتمہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیب کی جاں کنی تھی پرانا سماجی نظام، پرانی اخلاقی قدریں، پرانا تعلیمی ڈھانچہ سب بے جان نظر آنے لگا۔ان شعراء کے دل و دماغ پر اس سیاسی اور ثقافتی انقلاب کا گہرا اثر ہوا اور اردو شاعری بھی اسی کی ترجمانی کرنے لگی۔ یہی وہ دور تھا جب سوداؔ، آتشؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، شیفتہؔ، جیسے شاعروں نے غزل کے معیار، مزاج، لب و لہجے اور زبان کا تعین کیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جسے سرسیّد نے غدر کا نام دیا تھا دہلی کو بے حال کر دیا داغؔ دہلی چھوڑ کر رام پور چلے گئے بظاہر دہلی کا معنوی رنگ مفقود ہو چکا تھا دہلویت جو باقی تھی زبان کی حد تک رہ گئی۔

اس دور میں دہلی کے بعد میرٹھ شعر و ادب کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ ویسے بھی میرٹھ دہلی سے کم فاصلہ پر واقع ہے۔ میرٹھ کی اس ادبی فضا کے سلسلے میں ڈاکٹر صفدر حسین رقم طراز ہیں:

''یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں دبستان دہلی کے عناصر بہت قوی تھے علاوہ ازیں میرٹھ کی سرزمیں سے مولانا امام بخش صہبائی جیسے عالم پیدا ہوئے جنہوں نے دہلی کی علمی، ادبی اور مذہبی فضا میں اپنا نمایاں مقام پیدا کیا۔ میرٹھ میں انہیں کے شاگرد مرزا رحیم بیگ بھی موجود تھے۔ جنہوں نے مرزا غالبؔ کی علمی و ادبی مخالفت میں "ساطع برہان" تصنیف کی تھی۔''

[قندیل حرم: ڈاکٹر صفدر حسین]

غالبؔ کے ایک مخلص دوست ممتاز علی خاں اور دو مخصوص شاگرد محبوب علی خاں، منیر اور حکیم فصیح الدین رنجؔ اسی شہر کے رہنے والے تھے غالبؔ کے علاوہ حکیم مومن خاں مومنؔ کے بعض شاگرد مثلاً نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، اور غلام مولا بخش قلقؔ بھی یہیں کے باشندے تھے۔ پھر بیاںؔ کے معاصرین میں مولانا شوکت میرٹھی، اسماعیل میرٹھی اور سید سجاد حسین ریحانیؔ تھے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہینؔ رقم طراز ہیں:

"میرٹھ میں ثبات و فراز اور امن و امان کے حالات دتی سے زیادہ رہے ہیں میرٹھ اجڑا کم ہے سجا اور سنورا زیادہ ہے اور زبان و بیان میں نکھار، جماؤ اور ٹھہراؤ بھی آتا رہتا ہے۔ زبان اور تہذیب حالاتِ امن و قرار میں زیادہ ترقی کرتے ہیں اسی لئے حالات میرٹھ کی زبان کو پختہ اور رچا ہوا بناتے رہے۔"

[حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی۔ از ڈاکٹر راحت ابرار۔ ص]

ہندوستان جیسے طویل اور عریض برِ صغیر میں حکومت قائم کرنے کے لئے ہندوستانی پڑھے لکھے افراد کی کثیر تعداد میں فراہمی ناگزیر تھی۔ دوسری جانب انگریز افسران کو عوام کی زبان کا علم ہونا بھی ضروری تھا تا کہ حاکم و محکوم کے بیچ رابطہ قائم رہے۔ اسی مقصد کے تحت تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا جہاں تراجم کے ذریعہ انگریزی اور اردو ادب سے واقفیت حاصل کی جا سکتی تھی۔ انگریز اپنے ساتھ اپنی سائنس، فلسفہ اور اپنا ادب بھی لائے تھے۔

اس نئی تعلیم اور بدلے ہوئے حالات کا ردّ عمل دو طریقوں سے عمل میں آیا۔ اکثریت انگیزوں سے تعلق رکھنے والی ہر شے سے متنفر تھی وہ ہر ایسی چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے جس کا تعلق فرنگیوں سے ہو۔ لیکن چند دور بین اشخاص ایسے بھی تھے جنہوں نے اس تاریکی میں بھی تلاشِ راہ کے لئے خود انگریزوں سے روشنی مستعار لی۔ جن کے فہم و ادراک نے محسوس کیا کہ روشن مستقبل کا راستہ جدید علوم و ادب کے گلی کوچوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اگر ہم محض انگریز دشمنی کے باعث اس راستہ پر چلنا حرام قرار دیں گے تو یقیناً منزل ہماری دسترس سے ہمیشہ دور رہے گی۔ اس قافلہ کے سالارِ اعظم سرسید احمد خاں تھے۔ وہ اپنے معاصرین کے طنز و تبرّیٰ کے شکار رہے لیکن یقین محکم اور عمل پیہم کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہے اور لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

اسی دور میں میرٹھ کی زمین نے تین ایسی ہستیوں کو جنم دیا جو سرسید احمد خاں کے قافلہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تینوں ہستیاں اردو ادب میں تاریخ ساز اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے نام نامی ہیں حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی، محمد غلام مولیٰ قلقؔ میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی۔ حکیم فصیح الدین سے قبل اردو میں شعراء کے تذکرے تو موجود تھے لیکن اردو شاعرات کا کوئی تذکرہ اردو ادب میں موجود نہیں تھا۔ رنجؔ نے پہلی مرتبہ اردو شاعرات کا تذکرہ تالیف کیا اور مولانا محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ کے شانہ بشانہ جدید نظم کی بنیاد بھی ڈالی۔ قلقؔ میرٹھی نے انجمنِ پنجاب کے قیام سے تقریباً دس سال قبل انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کر کے جدید نظم کی بنیاد ڈالی اور مولانا اسماعیل

میرٹھی نے اس بنیاد پر نظم جدید کی عمارت تعمیر کرنے میں اہم ترین رول ادا کیا۔ انہوں نے اردو ادب میں پہلی بار انگریزی ادب سے متاثر ہو کر ہیئت کے تجربے کئے اور نظم معریٰ کی بنیاد رکھی۔ اس کے علاوہ کئی انگریزی نظموں کے اردو میں منظوم تراجم کئے۔ بچوں کا نہ صرف ادب تخلیق کیا بلکہ بچوں کے لئے نصابی کتب بھی تالیف کیں۔

آیئے ان تینوں تاریخ ساز ادبی شخصیات کی سوانح اور ادبی خدمات پر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں.........................

باب دوم

مولا بخش قلق میرٹھی

پیدائش:۱۸۳۳ء　　　وفات: ۱۸۸۱ء

مولا بخش قلق میرٹھی

ایک مقولہ ہے جس میں فلسفیانہ صداقت کا شائبہ خوب ہے" دنیا کے ذی کمال اشخاص کا بیشتر حصہ تاریکی وگمنامی کے پردے میں پوشیدہ رہتا ہے۔" اس کی تائید انگلستان کے حقیقت نگار شاعر گرے نے اپنے معروف مرثیے میں کی ہے۔ یوں بھی جب غائر نظر سے دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ان مشاہیر میں سے جو آج کل روشناس عالم ہیں اکثر ایک مدت تک لاعلمی اور گمنامی کے قعر ظلمات میں پڑے رہے اور پھر اتفاقیہ ایسے اسباب مہیا ہو گئے کہ دنیا پر ان کے کارنامے روشن ہوئے۔ قلق کا شمار بھی انہی شخصیات میں ہوتا ہے جن کے کارنامے اگرچہ ہندوستان کے علم دوست حلقہ میں قطعی طور پر اجنبی شمار نہیں کیے جا سکتے تاہم اہل ملک کا ایک بڑا حصہ طویل عرصہ تک اس کی اہمیت وافادیت سے بے خبر رہا۔

سوانح حیات

قلق میرٹھی اردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ جدید نظم کے حوالے سے ان کا نام قابل ذکر ہے۔ آج بھی جدید نظم کے بنیاد گزاروں

میں ان کا قد اونچا نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نظم جدید کی پگڈنڈی کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی اور ان کے پیروؤں و پس رفتگان نے اس پگڈنڈی کو شاہراہ میں تبدیل کرنے کا کارہائے نمایاں انجام دیا۔

فلق کا پورا نام غلام محمد مولا تھا اور فلق تخلص کرتے تھے۔ لیکن مولا بخش فلق کے نام سے وہ مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش ۱۲۴۹ھ بمطابق ۱۸۳۳ء میں میرٹھ کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ چونکہ اس وقت معزز گھرانوں میں بچوں کے تاریخی نام رکھنے کی روایت تھی اس لئے فلق کا تاریخی نام محمد غلام تجویز ہوا۔ جس کے اعداد و شمار سے ۱۲۴۹ نکلتا ہے۔ فلق کے اس تاریخی نام سے ان کے خاندان کے ادبی، مذہبی اور پروقار ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ تاریخی نام عام طور پر لوگوں کی زبان پر رواں نہیں ہوتے جبکہ اس کی جگہ عرفیت زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اسی طرح فلق کا نام بھی محمد غلام مولا مقبول نہ ہو کر مولا بخش زیادہ مقبول ہوا۔ فلق کے بزرگوں کے بارے میں امداد صابری نے ''دلی کی یادگار ہستیاں'' میں لکھا ہے :

> ''وطن ہمدان تھا جو ایران کا دارالخلافہ تھا۔ آپ (فلق) کے بزرگ نادر شاہ بادشاہ کے ہمراہ دہلی آئے اور کلاں محل کے قریب ایک بڑی حویلی میں مقیم ہو گئے۔''

[دلی کی یادگار ہستیاں ص۳۹۲۔ از مولوی امداد صابری، کامل صدیقی، جمال پریس، دہلی ۱۹۷۲ء]

حکیم مشتاق احمد جو فلق کی بہن کی اولاد میں سے ہیں، لکھتے ہیں:

> '' ہمارے بزرگ احمد شاہ ابدالی کی فوج میں جرنل تھے جو ابدالی

کے آخری حملہ میں ان کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے اور آگرے
تک فتح کرتے ہوئے پہنچ گئے اور بعد کو جب احمد شاہ ابدالی کی
فوجیں واپس ہو رہی تھیں تو دہلی کے قریب جاٹوں نے اِن
فوجوں کو گھیرنا چاہا لیکن اِس تیاری کی خبر احمد شاہ ابدالی کو لگ گئی
اور وہ آگرہ کے بجائے دہلی، متھرا، میرٹھ، باغپت اور سونی پت
ہوتا ہوا واپس چلا گیا اور اُن کے بزرگ جو احمد شاہ ابدالی کی فوج
میں جنرل تھے کسی نامعلوم سبب میرٹھ میں ٹھہر گے اور اِن ہی
جنرل سے ہمارا تعلق ہے۔ یعنی تیسری یا چوتھی پشت میں تھے"۔

[فلق میرٹھی: حیات اور کارنامے، ص:۱۸، ڈاکٹر جلال انجم]

فلق میرٹھی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ میرٹھ میں فلق کے بزرگ ٹھٹیرواڑہ میں
ایک مکان میں رہنے لگے۔ اِس مکان میں غلام مولا بخش فلق کی ولادت ہوئی۔ اِس
محلے میں اکثریت اہلِ ہنود کی ہے۔ میرٹھ میں ہندو مسلمان کا تنازعہ بھی ہمیشہ سرخیوں
میں رہا ہے۔ اس قضیہ کو فلق نے کیا خوب رنگ دیا ہے، ذرا دیکھئے:

"یہ ہندو زاد کا غل ہے فلق میرے محلے میں
زمیں ٹھوکر سے ہلتی ہے تو گردوں ڈگمگاتا ہے
غرض مندر سے کچھ ایسے مسلماں کش نکلتے ہیں
کہ توبہ منہ کی کھاتی ہے اور ایماں بم مچاتا ہے۔"

تعلیم و تربیت :

قلق کی ابتدائی تعلیم محلے کے مکتب میں شروع ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں عربی اور فارسی کی بنیادی کتابیں انہوں نے ختم کرلیں ۔ ملا انتظام علی سہارن پوری میرٹھ میں مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے جو اپنے عہد کے ایک جید عالم تھے۔ قلق نے بارہ برس کی عمر میں عربی فارسی کا اچھا خاصا مطالعہ کرلیا تھا۔ قلق کی ذہانت دیکھ کر قیاس کیا جاتا ہے کہ ملا انتظام علی سہارن پوری نے قلق کے والد کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے بیٹے کو مزید تعلیم کے لئے دہلی بھیج دیں ۔ دہلی باوجودیکہ اس وقت خزاں کے جھونکے چلنے شروع ہو گئے تھے، علم و فن کے اعتبار سے کملا و فضلا کا مرجع بنی ہوئی تھی اور تشنہ گان ادب کی نظروں میں اس کی وہی قدر و منزلت تھی جو ازمنہ سابقہ میں عروج اسلام کے پہلو بہ پہلو نیشاپور و بغداد کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔

سید محمد فاروق لکھتے ہیں:

> ''قلق نے حیاتِ مستعار کی بارہ منزلیں بمشکل طے کی ہوں گی کہ دہلی کے آب و دانہ کی کشش سے مجبور ہو کر انہیں اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس سفر سے غرض محض اکتساب علم تھا۔''
>
> [قلق میرٹھی: نگار پاکستان، جولائی ۱۹۶۳ء ص:۱۲]

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قلق ۱۸۴۵ء میں دہلی پہنچے ہوں گے۔

قلق امام بخش صہبائی کے شاگرد اور ان کے صاحبزادے مولوی عبدالکریم سوز کے ہم سبق بھی تھے۔ انہوں نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی ۔ دہلی میں مدرسہ

غازی الدین مشرقی علوم کا قدیم مدرسہ تھا۔ جس کی بنیاد ۱۷۹۲ء میں رکھی گئی تھی اور ۱۸۲۵ء میں اس کا نام تبدیل کر کے دہلی کالج رکھا گیا۔ اس میں مشرقی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم بھی جاری کی گئی اور بیرونی طلبہ کو وظیفے کے لیے دعوت مقابلہ دی گئی، چونکہ قلق ۱۸۴۰ء سے قبل دہلی آگئے تھے اور دہلی آنے کا مقصد بھی تعلیم حاصل کرنا تھا چنانچہ وہ بھی ان مقابلوں میں شریک ہوئے۔

قلق نے دہلی کالج میں تعلیم کے دوران انگریزی کا مطالعہ بھی کیا۔ دہلی کالج میں فارسی کے طلبہ کے لئے انگریزی کی کلاسز کا خاصا انتظام تھا۔ انہوں نے بھی اس کا فائدہ اٹھایا۔ طب کی تعلیم انہوں نے دہلی کے مشہور و معروف طبیب حکیم غلام نقشبند خاں سے حاصل کی۔ حکیم صاحب کا شمار ہندوستان کے ان معدودے چند مقبول حکیموں میں تھا جن کا چرچہ دور دور تک تھا۔ بقول سید محمد فاروق:

> ''قلق نے دہلی رہ کر اپنی مراد پائی اور اس وقت تک کے رواج کے مطابق کوئی خامی ان کی تعلیم میں باقی نہ رہی۔''
>
> [قلق میرٹھی۔ نگار پاکستان ۱۹۶۳ء ص:۱۳]

ادبی مشاغل:

قلق نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی اور کوچہ چیلان میں رہنے لگے۔ مومن خاں مومنؔ کا مکان نزدیک ہونے اور مزاج کی قربت نے انہیں مومنؔ کا شاگرد بنا دیا، جس کا ذکر مولوی محمد حسین آزادؔ نے 'آب حیات' میں اس طرح کیا ہے:

''مولا بخش قلق، مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد رشید دیوان نظیری پڑھتے تھے۔ ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے، انہوں نے ایسے نازک معنی اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے''۔

[آب حیات۔ محمد حسین آزاد۔ ص:۵۰۷]

قلق اور مومن کے مزاج میں بڑی حد تک یکسانیت تھی، اس لئے بہت جلد اپنی صلاحیتوں سے مقبول خاص و عام ہو گئے اور ایک عام اردو جاننے والے کو مومن اور قلق کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہو گیا۔ سید احمد دہلوی نے اس پہلو کو اس طرح سے اجاگر کیا ہے:

''استاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہیے وہ آپ میں اور حضرت مومن خاں میں بخوبی موجود ہے۔ کوئی بڑا ہی صاحب مذاق ہو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو مومن خاں ہی کے ہیں البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے ورنہ ہر ایک کا کام نہیں کہ مومن اور قلق کے سخن میں تمیز کر سکے۔ قلق کے بعض شعروں سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، جس کا احساس خود قلق کو بھی تھا۔''

[تقریظ کلیات قلق۔ ص:۳۶۵]

قلق کی شاعری کے چرچے جب دہلی میں ہونے لگے تو ان کی شہرت میں

اور بھی پر لگ گیا لیکن یہ ستم ظریفی زمانہ ہے کہ جوں جوں ان کی شاعری شباب پر پہنچی مغلیہ حکومت کی رہی سہی بساط بھی الٹ گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان شعر وادب کی خوبصورت محفلوں کو اجاڑ دیا۔ کئی شعراء کو سرعام قتل کر دیا گیا۔ ان میں قلق کے استاد مولانا امام بخش صہبائی اور قلق کے ہم درس صہبائی کے صاحبزادے مولوی عبدالکریم سوؔز بھی شامل تھے۔ بہتوں نے دہلی کو خیر باد کہا۔ قلق بھی ایسے شعراء میں شامل تھے۔ وہ دہلی چھوڑ کر اپنے وطن میرٹھ لوٹ تو آئے لیکن ان محفلوں کی شگفتگی کا احساس انہیں مرتے دم تک رہا اور قلق نے اس قلق کو اشعار کا جامہ پہنایا :

قلق کیوں چھوڑتا دہلی کو کیوں میرٹھ میں آ رہتا
گدائی کے بھروسہ پر لٹایا بادشاہی کو

میرٹھ میں ہے قلق مگر بلبل غریب
افسوس ہے کہ تیرا کوئی ہم زباں نہیں

ان کے اندر پوشیدہ حقیقی فنکار کی روح نے انہیں میرٹھ میں چین سے نہیں رہنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فرصت ملتے ہی سب سے پہلے استاد مومؔن کی کلیات ترتیب دی اور پورے اہتمام کے ساتھ ۱۲۸۲ھ میں شائع کرایا۔ اس واقعہ سے اس وقت استاد اور شاگرد کے باہمی ربط اور مستحکم رشتہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو آج رفتہ رفتہ ٹوٹتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

ملازمت اور طبابت :

اس وقت دہلی کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کو فارسی مدرس کی جگہ آسانی سے مل جاتی تھی، اس لئے کلب علی خاں فائق نے قیاساً لکھا ہے:

''وہ دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر کسی ملازمت سے منسلک ہوگئے تھے۔''

[مقدمہ کلیات قلق، ص:۳۶، مرتب کلب علی خاں فائق]

اس ضمن میں فائق مزید فرماتے ہیں:

''اس طرح قلق نے ذہانت اور مشق سے دلّی کی علمی اور ادبی مجلسوں میں اچھا مقام پیدا کرلیا۔ وہ عربی کی تعلیم کی تکمیل اور فن طب پر عبور حاصل کرنے کے لئے دہلی ہی میں رہ پڑے۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ انہیں کسی سرکاری مدرسے میں مدرس کی جگہ مل گئی ہوگی، جس طرح کہ بعد میں ملازمت سرکاری پر ہی ان کی ضروریات کا انحصار رہا۔''

[مقدمہ کلیات قلق، مرتبہ کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۶ء ص:۴۱]

۱۸۵۷ء میں جب دہلی کا شیرازہ بکھرا اور پرانے دوست احباب سب جدا ہوگئے تو قلق میرٹھی کو بھی دہلی چھوڑنا پڑا۔ کلب علی خاں فائق کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک قلق راجہ گلاب سنگھ والی کچیسر کے دربار سے وابستہ رہے لیکن کچیسر میں جو بلند شہر کا ایک حصہ تھا، دلّی جیسی ادبی محفلیں کہاں؟ شعراء کہاں؟ لیکن مجبوراً انہیں

کچہری رہنا پڑا اور جیسے ہی دوسری ملازمت ملی انہوں نے کچہری کو خیر باد کہہ دیا۔ کچہری کے حال کو اپنے شعروں میں کچھ اس طرح طاقت گویائی دی ہے:

سبھی اجاڑ کچہری بلا سے جی نہ لگے
نہیں مشاہرہ کچھ سو سے کم جو ہوں سی بیست
سبھی کو لطف ہے، عشرت ہے، شاہد و مے ہے
فقط قلق ہی ہے ایک بے نصیب بد خط زیست

وہ کچہری کے کھانے سے بھی نالاں تھے:

ماس بن ہے رسوائی اپنی بھنڈ
دال اور ہم ہری ہری مہراج
دال دیجئے گئو کے جایوں کو
دانا خوری کا بیل ہے محتاج

کچہری سے قلق میرٹھ لوٹے اور پھر چند ہی دنوں میں سر رشتہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"قلق میرٹھی انسپکٹر آف اسکولس کے دفتر میں ترجمہ کا کام کرتے تھے۔ اسماعیل میرٹھی بھی ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۷ء تک ان کے ساتھ رہے۔"

[اسماعیل میرٹھی حیات اور خدمات: ڈاکٹر سیفی پریمی، ص: ۴۰]

جبکہ سیّد محمد فاروق کا خیال ہے کہ قلق میرٹھی نے فارسی کے مدرّس کی حیثیت

سے اپنی خدمات انجام دیں :

"قیامِ میرٹھ کا یہ زمانہ معمولی مشاغل روزمرّہ کی نذر رہا۔ کچھ عرصہ تک بعض مدارس میں فارسی مدرّس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مطب بھی ہمیشہ جاری رکھا۔"

[نگار پاکستان جولائی ۱۹۶۳ء ص ۱۴]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قلق نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ طبابت کو بھی جاری رکھا۔ قلق کی طب میں مہارت کا دور دور تک شہرہ تھا، اس دور کے ایک بڑے حکیم اور عوامی رہنما حکیم طالب احمد کا کہنا ہے کہ :

"ان کو (قلق) فنِ طب میں ید طولیٰ حاصل تھا اور میرٹھ جیسے شہر میں جو حکیموں کا مخزن ہے، ان کے مطب کا شہرہ حیرت انگیز صورت اختیار کر چکا تھا۔ جوق جوق ہر قسم کے مریض آتے تھے اور ان کے علاج سے صحت اور تندرستی حاصل کر کے دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے تھے۔"

[فہرست مرکبات۔ ص ۱۔ حکیم طالب احمد ہمدانی]

کلب علی خاں فائق کے مطابق کچھ غیر ملکی مریض بھی ان کے پاس بغرض علاج آتے تھے لیکن جیسے جیسے عوام نے انگریزی طریقہ علاج کو ترجیح دینی شروع کی اس کا اثر اطبآء کے ذریعہ معاش پر پڑنے لگا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ مریضوں کا ایک ہجوم جو ان کے مطب پر لگا رہتا تھا، آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔

اب اطباء کیا جئیں جاتی رہی وجہ معاش
بچ گیا بیمار غم اور ہو گیا رسوا علاج

قیام دہلی کے دوران قلق خود کو شراب نوشی کی محفلوں سے نہ بچا سکے اور اس کے اتنے عادی ہو گئے کہ شراب نوشی کی زیادتی نے انہیں سل (تپ دق) کی بیماری میں مبتلا کر دیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی اس تعلق سے کہتے ہیں :

"حکیم مغفور (قلق) جو موزونی طبع اور جودت ذہن کے علاوہ فکر عمیق اور نظر دقیق رکھتے ہیں مشاغل علمیہ کے باوجود اپنے آپ کو مردافگن شراب سے محفوظ نہ رکھ سکے۔"

[تقریظ کلیات قلق۔ ص:۳۵۳]

قلق نے اپنی زندگی کے آخری دس برس بڑی پریشان حالی میں گزارے۔ ایک طرف تنگئی روزگار تو دوسری طرف سل جیسی جان لیوا بیماری نے انہیں آن گھیرا۔ اس لئے ملازمت ترک کر کے انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کو ترجیح دی اور طبابت پر اکتفا کیا۔ تاہم قلق اپنی جان لیوا بیماری سے کبھی نہیں گھبرائے اور اس بیماری سے نجات پانے کے لئے خدا کے حضور میں دعا مانگتے رہے۔

اے قادر مطلق بطفیل لو لاک
دے مجھ کو شفا مرض سے کر دے تن پاک
ناچیز ہے کس چیز سے شایان عذاب
جان تیری ہے اور جسم ہے سرمایہ خاک

لیکن ۷ شعبان المعظم ۱۲۹۷ھ کو یہ چراغ علم وادب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ فلق کی تدفین حضرت چشتی صاحب کے قبرستان میں ان کے شاگرد گلاب سنگھ مشتاق نے قطعہ تاریخ وفات لکھا:

مر گیا یکتائے عصر کی سن کر	ہر سخن ور کا دل دو نیم ہوا
بولا مشتاق بے سر امید	حیف ہے اب سخن یتیم ہوا
۱۹۳۸ء	۱۲۹۷ھ

ہجری کے علاوہ چونکہ ۳۸۔۱۹۳۷ سمبت کا سال تھا اس لئے مشتاق نے سمبت میں تاریخ وفات بھی لکھی جو اس طرح ہے :

مر گیا ہے ہے فلق کیا خوش بیاں	گل چراغ شاعری ہی کر گیا
بے سر اشعار اے مشتاق لکھ	شاعر یکتائے میرٹھ مر گیا
۱۹۳۸ء	۱۹۳۷ سمبت

فلق کی کلیات اگر چہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی بابو محمد عبد اللہ نے فلق کے کلام کو یکجا کر کے ان کی وصیت کو عملی شکل دی۔ فلق کے انتقال کے دو سال بعد ۱۲۹۹ھ میں کلیات فلق شائع ہوئی۔

ادبی خدمات :

فلق میرٹھی کی کلیات میں غزلیات، مثلث، رباعیات، مخمسات، مسدسات، متفرقات، واسوخت، مرثیہ، قصاید، قطعات، اور منظوم رقعات شامل ہیں

لیکن جو ان کی سعئ جمیلہ ان کو نظم جدید کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز شخصیت قرار دیتی ہے وہ ان کے انگریزی نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔

قلق کے منظوم تراجم اور جدید نظم

۱۸۵۷ء وہ حشر خیز زمانہ تھا جب سامراجیت اور آزادی میں معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ اس سے اگرچہ آئندہ ایک صدی کے لئے محکومیت کی بنیاد مضبوط ہوگئی لیکن اس شکست کے بطن سے وہ آفتاب تازہ بھی پیدا ہوا جس نے آگے چل کر ہر سماجی، ذہنی، اور ادبی تحریک کو روشنی اور حرارت دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد گویا جدید اثرات اور نئی روشنی کی شاہ راہ کھل گئی۔ اردو میں جدید نظم کی ابتدا ان ہی اثرات کا نتیجہ تھی۔

گو کہ جدید نظم کا سہرا محمد حسین آزاد اور ان کے رفقاء کے سر باندھا جاتا ہے مگر اس سے کئی سال قبل قلق میرٹھی نظم جدید کی راہ پر اپنے قدم ثبت کر چکے تھے۔ بقول ممتاز نقاد، نظریہ ساز و ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں:

> "۱۸۶۷ء میں جب آزاد بھی اس سلسلے میں خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے غلام مولا قلق میرٹھی کی پندرہ انگریزی نظموں کا ترجمہ 'جواہر منظوم' کے نام سے دوسری بار شائع ہو چکا تھا۔"

[مقدمہ۔ اسماعیل میرٹھی حیات وخدمات، ڈاکٹر سیفی پریمی، ص:۴۰]

لہٰذا ہمارا یہ دعویٰ بے معنی نہیں کہ جدید اردو نظم کی تاریخ میں قلق میرٹھی کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جانا چاہئے۔ ڈاکٹر جلال انجم نے بھی جدید نظم کی داغ بیل کا سہرا

قلق میرٹھی کے ہی سر باندھا ہے۔ قلق جب میرٹھ میں سر رشتہ تعلیم میں ملازم تھے انہوں نے حسب ارشاد فیض بنیاد لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی انگریزی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ یہی جدید نظم کی بنیاد کا سنگ اول تھا۔ قلق کا یہ پروجیکٹ ''جواہر منظوم'' کے نام سے ۱۸۶۴ء میں مکمل ہوا۔ اس مجموعہ پر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے نظر ثانی کی اور ۱۸۶۴ء میں یہ گورنمنٹ پریس الہٰ آباد سے شائع ہوا۔ فرانسیسی مصنف گارساں دتاسی نے ۳/دسمبر ۱۸۶۶ء کے اپنے سولہویں خطبہ میں ''جواہر منظوم'' کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''اس کتاب کے علاوہ ۱۸۶۴ء میں الہٰ آباد سے 'جواہر منظوم' نام سے ایک مجموعہ نظم شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بعض انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ ہے، ترجمہ بھی نظم میں ہے۔ حواشی میں عروض کے مسائل کے متعلق ارشادات ہیں تا کہ صوبہ شمال مغرب کے طلبہ بھی اس مجموعہ سے مستفید ہوسکیں۔ ان حواشی میں جو بحریں رکھی گئی ہیں وہ طلبہ کی مشق کے لئے ہیں۔ اردو ترجمہ کے مقابل اصل انگریزی بھی ہے تا کہ طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ اردو اور انگریزی دونوں میں ترقی کر سکیں۔ انگریزی کی بعض نظمیں ایسی ہیں جن کا اردو میں خاطر خواہ ترجمہ کرنا دشوار ہے لیکن مترجم نے نہایت سلیقے کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے۔ انگریزی اور اردو نظمیں ایک دوسرے سے بالکل

مختلف ہوتی ہیں۔ خیالات اور محاورے ایک دوسرے کے ساتھ بالکل مناسبت نہیں رکھتے۔ مترجم میں جب تک خاص طور پر ایسی صلاحیت نہ ہو کہ اصل کو اپنے الفاظ کے ذریعہ ظاہر کر سکے اس وقت تک اس کام کو سلیقہ کے ساتھ پورا کرنا بہت مشکل ہے۔ مترجم کو ایک تو اصل مطلب کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے اور دوسری طرف اس مطلب کو ایسے الفاظ میں پیش کرنا چاہئے کہ اس کو اہل وطن سمجھ سکیں۔ میرے خیال میں اگر ترجمے کے لئے ایسی نظمیں چنی جاتیں جن میں انگریزیت کم ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ انگریزی زبان میں ایسی نظمیں موجود ہیں جن کے موضوع میں عالم گیر دلچسپی کے عناصر موجود ہیں"۔

[خطبات گارساں دتاسی ص: ۵۲۸، ۵۲۹، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵]

حسن الدین 'جواہر منظوم' کو اردو تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں :

"قلق میرٹھی نے بعض حکامان وقت کی فرمائش پر منتخب انگریزی نظموں کا ترجمہ 'جواہر منظوم' کے نام سے کیا جس کی طباعت ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ پریس الہٰ آباد میں ہوئی جواہر منظوم کو اردو منظوم تراجم کا پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان منظوم تراجم پر مرزا اسداللہ خاں غالب نے نظر ثانی بھی کی تھی۔"

[انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ص ۱۲۱۔ حسن الدین احمد]

اس طرح یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں اور تراجم سے دس سال قبل قلق میرٹھی کا منظوم ترجمہ "جواہر منظوم" شائع ہو چکا تھا بلکہ ۱۸۷۴ء تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ قلق اور دوسرے مترجمین کے کم مقبول ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ ترجمے رسائل و اخبارات میں شائع نہیں ہوئے۔ اس طرح یہ ترجمے ترسیل و ابلاغ سے محروم رہے۔ یہ کم نصیبی ہی تو ہے کہ ان ترجموں سے متاثر ہو کر جنہوں نے نظمیں کہیں یا ترجمے کئے وہ تو مقبول ہوئے لیکن اصل آواز نے اس حوالے سے مقبولیت حاصل نہیں کی۔ اگر یہ تراجم اور نظمیں اخبارات کی زینت بنتے تو یقیناً آج ہر طالب علم نہ صرف ان ترجموں اور نظموں سے خود پوری طرح روشناس ہوتا بلکہ ان کے خالق کی شخصیت و علمیت کا بھی قائل ہوتا۔ اسماعیل میرٹھی، حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے ان ترجموں سے استفادہ کیا۔

امیر اللہ خاں شاہین رقمطراز ہیں:

> "اس وقت افسر تعلیم جناب کیمسن تھے ان کے حکم سے انسپکٹر ٹی جے کین نے کچھ اخلاقی نظموں کو چن کر ایک نصابی کتاب بنائی۔ ان نظموں کا ترجمہ قلق میرٹھی نے کیا تھا۔ مولانا اسماعیل نے جب اس خوبصورت ترجمے کو دیکھا تو ان پر اس کا بہت بڑا اثر ہوا اور اس کے بعد ہی سے ان کی شاعری نے نیا موڑ لیا۔"
>
> [تحقیق و تنقید۔ از ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین ص ۱۲۲]

محمد حسین آزاد اور ان کے رفقاء نے اس سے متاثر ہو کر جدید نظم نگاری کے

لئے خود کو تیار کیا۔ اس جستجو کے دوران محمد حسین آزاد کو کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ آزاد نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور انجمن پنجاب کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ اس کے ماہانہ مشاعروں کی روداد یں اخبارات میں شائع ہوئیں اور اس تحریک کو پھلنے پھولنے کے مواقع دستیاب ہوئے۔

'جواہر منظوم' پندرہ نظموں پر مشتمل ہے۔ جس کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(۱) اوصاف اخلاق شتر (۲) بیان کرمک (۳) حکایت پسر نا خدا (۴) بیان جنت (۵) میرا باپ کشتی بان ہے (۶) بیان ہندوستان (۷) داستان اندھے لڑکے کی (۸) داستان شاہ کینیوٹ (۹) قصہ ویم ٹیل ساکن سویٹزر لینڈ (۱۰) خواہش طفل (۱۱) عرض موش محبوس (۱۲) لڑکپن کی پہلی مصیبت (۱۳) دربان تمیز حق و باطل (۱۴) ذکر ابابیل بدیسی کا اور (۱۵) سادگی طبیعت کی خواہش۔

تمام نظموں کا یہاں تفصیلی تجزیہ تو ممکن نہیں البتہ مختصراً چند منظوم ترجموں کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ''حکایت پسر نا خدا'' Felicia Heman کی نظم Casablanca کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ نظم ۱۷۹۸ء کی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی جنگ سے متعلق ہے۔ جنگ میں فرانسیسیوں کا ایک جہاز جل گیا تھا۔ بچے کا باپ اس جہاز کا کپتان تھا جو گولا باری میں کام آ گیا۔ کپتان کی موت کے بعد پورا عملہ جہاز چھوڑ کر بھاگ نکلا لیکن کپتان کا لڑکا اپنے باپ کی لاش کے پاس بہادری سے ڈٹا رہا۔ جب جہاز غرق ہوا تو یہ لڑکا بھی جہاز کے ساتھ سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لئے سو گیا۔ پہلا بند مع ترجمہ حاضر ہے۔

Whence all but he had fled,

The flame that lit the battles wreck

Shone around him on the dead.

ایک جنگی جہاز میں جو آگ   لگ گئی آدمی گئے سب بھاگ

ناخدا کا رہا فقط لڑکا   سہم سا بالائے بام حجرہ کھڑا

ترجمہ سادہ سلیس اردو میں کیا گیا ہے۔ قلق نے "داستان اندھے لڑکے کی" میں C-Cibber کی نظم The Blind Boy کا ترجمہ کیا ہے۔

"You talk of wonderous things you see,

You say the sun shines bright.

I feel him warm but how can he

Or make it day and night ?"

دیکھتے ہو عجائبات جہاں   کہتے ہو آفتاب ہے رخشاں

گرم پاتا ہوں اس کو میں لیکن   نہیں معلوم رات ہے یا دن

قلق کا آخری سطر کا ترجمہ تشنہ ہے۔

لڑکپن کی پہلی مصیبت کا ایک بند ملاحظہ ہو:

"And by the brooks and in the glade,

Are all over wander is over

Oh while my brother with me play,

Would I had looked him more"

Felicia Heman

مرغ زار اور چشمہ زاروں پر	ساتھ پھرتا ہوا وہ سب آخر
آہ جب بھائی ساتھ کھیلتا تھا	کاش میں خوب پیار کر لیتا

اگر ادب کی اعلیٰ قدروں اور اردو شاعری کے بلند معیار پر ان کو پرکھا جائے تو ان میں بہت سی خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ تاہم ان تراجم کا مطالعہ منظوم ترجموں اور نظم جدید کے ارتقاء کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ جدید نظم کی راہ پر پہلا قدم ہے اور یقیناً کسی بھی سفر کا اختتام یا منزل مقصود تک پہنچ پانا تبھی ممکن ہے جب منزل کی جانب سچے ارادے اور عزائم کے ساتھ قدم رکھا جائے، لیکن افسوس کہ کرنل ہالرائڈ کی طرح اگر کیمسن بھی کوئی انجمن بنا لیتے تو ان کی عظمت کا اعتراف بھی ہر شخص کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی انجمن پنجاب اور ہالرائڈ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ :

> ''آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کے جن موضوعی مشاعروں کی بنیاد ڈالی تھی آگے چل کر اس پر عظیم عمارت کھڑی کی گئی۔ غلام مولیٰ بخش قلق میرٹھی اور اسماعیل میرٹھی کے منظوم تراجم کو دیکھ کر اس دور کو دور تراجم کہا جا سکتا ہے۔''

جدید نظم نگاری کے فروغ میں ایک بڑا حصہ قلق میرٹھی کا ہے۔ اگر قلق میرٹھی ترجمے نہ کرتے تو ممکن ہے ایک عرصے تک دیگر شعراء کی اس طرف توجہ نہ ہوتی اور ہم

ایک قیمتی ادبی سرمائے سے محروم رہتے۔ یہ حقیقت ہے کہ جدید نظم کی سب سے پہلے سرپرستی کرنل ہالرائڈ نے نہیں بلکہ اس سے دس سال قبل ۱۸۶۴ء میں کیمسن نے کی تھی اور اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے قلق میرٹھی نے انجام دیا۔ اپنی اس خدمت کے باعث وہ جدید نظم کے بانی و بنیاد گزار کہلانے کے پوری طرح مستحق ہیں۔

قلق بحیثیت روایتی شاعر

قلق بحیثیت غزل گو :

قلق نے جب شاعری کا آغاز کیا تو دلی میں شعروشاعری کا بڑا شور تھا اور بہ یک وقت دو رجحانات کے بادل دلی کے شاعرانہ افق پر منڈلا رہے تھے۔ ان میں ایک معنویت اور بلندی خیال کو لازمی قرار دیتا تھا، دوسرا زبان و بیان کی سلاست اور اس کے خارجی لوازمات کو برتر اور بہتر تسلیم کرتا تھا۔ اول الذکر کا تعلق غالب کی شاعری سے تھا اور آخر الذکر کا تعلق ذوق اور شاہ نصیر سے۔ لیکن ان میں بھی دوسرے رجحان کی شاعری زیادہ مقبول عام تھی۔ تاہم غالب مخالفت کے باجود اپنی انفرادی ڈگر پر ڈٹے رہے۔ قلق کی خوبی یہ ہے کہ ان کے کلام میں ان دونوں رجحانات کا دل آویز اور شیریں امتزاج ملتا ہے۔ قلق کے کلام میں معنویت اور بلندی خیال کے ساتھ ساتھ آسان زبان، منفرد لب ولہجہ اور خوبصورت پیکر تراشی دیکھنے کو ملتی ہے۔

قلق نے اپنی شاعری کی ابتدا فارسی سے کی لیکن جب انہوں نے مومن کی شاگردی اختیار کی تو اردو میں بھی شعر کہنے لگے اور آج وہ اپنے ان ہی اشعار کی بدولت زندہ بھی ہیں۔

قلق کی کلیات ان کے برادر حقیقی منشی عبداللہ نے ان کی وفات کے دوسال بعد شائع کرائی، جس پر خواجہ الطاف حسین حالیؔ، شیخ ابوسلیمان، مظفر احمد محویؔ، مولوی سیّد احمد دہلوی، حافظ امداد حسین ظہور میرٹھی اور عبدالحئ قضاؔ وغیرہ کی تقاریظ ہیں۔

قلقؔ میرٹھی کی غزلوں کا عمیق مطالعہ کرنے سے ان میں تغزل، نازک خیالی، سادہ بیانی، معاملہ بندی، تصوف اور عارفانہ خیالات کے ساتھ معنیٰ آفرینی کا احساس بطورِ خاص ہوتا ہے۔ روایتی انداز میں ان کی غزلوں کا معیار اسی لئے خاصا بلند نظر آتا ہے۔ قلقؔ کو کلام میں تغزل کی فراوانی ورثے میں ملی تھی۔ مومنؔ کے تلامذہ میں یہ خوبی موجود ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے :

> ''اس سلسلے میں پہلی خصوصیت جو بطور قدرِ مشترک سب [تلامذہ مومن] کے یہاں ملتی ہے اور جو انہوں نے مومن سے ورثے میں پائی ہے تغزل ہے۔ تغزل جیسا کہ سب واقف ہیں غزل سے مشتق ہے جو حکایت از معشوق سے عبارت ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ یہ وصف دوسرے شعراء کے یہاں مفقود ہے البتہ یہ واقعہ ہے کہ زمانے کے اثر سے ان حضرات نے تصوف و اخلاق کی طرف بھی توجہ کی ہے لیکن تغزل کے عنصر ان کے یہاں غالب ہیں''۔
>
> [مومنؔ: شخصیت اور فن ص ۲۳۱۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی]

مذکورہ اقتباس کی مناسبت سے قلقؔ کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اگر نصیب میں ہوتا شریک غم کوئی

تو کس طرح سے تمہیں آپ سانہ کرتے ہم

جو عمر خضر بھی دیتے تو رائگاں جاتی

تمہاری زلف کا کیا کیا فسانہ کرتے ہم

اپنا گھر چھوڑ کے وہ غیر کے گھر رہنے لگے

ہائے کیا شرم چڑھی ہے انہیں رسوا ہوکر

دل میں رہتا ہے کون غم کے سوا

کوئی اس گھر میں دوسرا نہ رہا

پھرے ہے چھپتی ہوئی سامنے نہیں آتی

تیری حیا نے حیا کو بھی شرمسار کیا

اس ابتدا سے کہ ہے اس کا اخیر میرا سا

خوشی کی جاہے جو دشمن کو رازدار کیا

ایک ہم ہیں کہ تیرے نام کا لینا آفت

ایک وہ ہیں کہ تجھے گھر میں بٹھا رکھتے ہیں

قلق کے کلام میں شوخی طبیعت اور نازک خیالی کے تعلق سے سید احمد دہلوی لکھتے ہیں :

"ان کے تڑپتے ہوئے اشعار آپ کی طبیعت کی شوخی وزبان کی سلاست اور خیال کی نزاکت کے گواہ ہیں۔"

[کلیات اردوئے قلق ص:۳۶۵]

اب ان کے ذرا یہ اشعار بھی دیکھئے:

خط مرا واں گیا گیا نہ گیا
سر قاصد رہا رہا نہ رہا

کیا ہوا کیوں قلق کو روتے ہو
کوئی اس دیر میں سدا نہ رہا

کیوں کہ چھپ چھپ کے تجھ کو دیکھتے ہم
قتل کیا بار بار ہونا تھا

غیر اور شکوہ جفا تم سے
ہائے میں قابل وفا نہ رہا

اے قلق شاعری ہے رسوائی
شہرہ ہر دیار ہونا تھا

نالہ کرتا ہوں لوگ سنتے ہیں
آپ سے میرا کچھ کلام نہیں

ان اشعار میں اسلوب کا انوکھا پن دل کو بھاتا ہے اور مضمون آفرینی کا تو جواب ہی نہیں۔ وہ جس مضمون کو بھی باندھتے ہیں بہت سادگی سے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی سادہ بیانی میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ سادہ بیانی کا عالم یہ ہے کہ قلق کا کلام مومن جیسا معلوم ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو ان دونوں میں فرق کرنا مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے سید احمد دہلوی فرماتے ہیں:

”کوئی بڑا ہی صاحب مذاق ہو تو شاید یہ کہہ سکے کہ اشعار تو
مومنؔ خاں کے ہیں مگر ابتدا اور انتہا میں کہیں کہیں فرق ہے ورنہ
ہر ایک کا کام نہیں کہ مومن اور قلقؔ کے کلام میں فرق کر سکے۔“

[کلیات اردوئے قلقؔ، سید احمد دہلوی، ص: ۳۶۵]

آیئے اب ان شعروں کو پڑھئے اور سر دھنئے اور یہ دیکھئے کہ قلقؔ اور مومنؔ کے کلام میں کتنی یکسانیت ہے۔

ہمیں کیوں دل دیا اور دلربائی ان میں کیوں رکھی
خدا دشمن بتوں کی بندگی سے ہو نہیں سکتا

قلقؔ پیغام تیرا اور بیاں پھر اس ستمگر سے
کسی سے ہو نہیں سکتا، کسی سے ہو نہیں سکتا

ہر وقت اس کے آنے کی رکھتا ہے آرزو
دل بھی ہمارا خانہ اغیار ہو گیا

حادثہ جو میرے دل پر تھا وہ ان پر آیا
کہ عدو ان کی شکایت کو مرے گھر آیا

قلقؔ میرٹھی کا عہد سیاسی غلامی اور اقتصادی بدحالی کا عہد تھا۔ اس لئے دہلی کے دوسرے شعراء کی طرح ان کے کلام میں بھی یاسیت اور ہجر نصیبی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں یاسیت کا جذبہ میرؔ کا سا تو نہیں پھر بھی کیف آور ضرور ہے۔
چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کوچہ غیر میں کیونکر نہ بناؤں گھر کو

میری آبادی سے آباد ہے ویراں ہونا

تجھکو ارمان خرابی ہے جو اے دہلی اور

سیکھ جا گھر میں مرے رہ کے بیاباں ہونا

جب اپنا حال دیکھنا رو پڑتا خود بخود

پیمانہ عمر کا کہیں سر شار ہو گیا

کوئی لیتا نہیں خبر شب ہجر

وہ نہ آتے تو صبر آ جاتا

فلق کے کلام میں تلمیحات کا بھی خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ مشتے نمونہ ازخروارے یہ اشعار پیش خدمت ہیں:

کلیم و خضر نہ ظلمات و طور تک جاتے

تمہارے کوچہ میں انساں کا گر گزر ہوتا

وہ خود نا تجربہ ہے کیا کرے درماں میرا عیسیٰ

مژہ پرنم، نہ دل میں داغ، خشک وتر سے کیا واقف

فلق کہاں سے میں لاؤں تیرے لئے آرام

ابھی تو خلد کو لے لوں جو دیں ادھار مجھے

دبستان دہلی کے شعراء میں مذہب وتصوف کا احساس پایا جاتا ہے۔ اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کی تلافی کے لئے ان شعراء نے تصوف کے دامن میں پناہ لی۔

فلق کی شاعری میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے۔

خود دیکھ خودی کو او خود آرا
پہچان خود کو بھی خدارا
ڈھیر ہے اک غبارِ خاطر کا
خاک ہے جس کا دل صفا نہ ہوا
ہر وقت پیر دیر کے در پر ہے یہ جواں
شاید فلق بھی واقف اسرار ہو گیا

فلق کے یہاں روایتی شاعری کے سارے موضوعات قاصد، گل و بلبل، دیر و کعبہ، میکدہ، زلف، رخسار، فرہاد و وامق وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے غزل کا رشتہ کبھی ماضی سے منقطع نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شعروں میں پختگی کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار اس بات کے غماز ہیں :

اہل قبلہ کو ہے تلاش امام
اے فلق تو ہی پارسا نہ ہوا
اے فلق میکدے میں سجدے کیوں
کون دیگا پئے ثواب شراب
وامق و قیس و کو کہن کیا تھے
اجل و آفت و بلا ہے عشق
اے فلق پیتے ہی مسجد میں چلے آتے ہو

بے خبر کتنے ہو تم بھی کہ خبر کچھ بھی نہیں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دراصل قلق میرٹھی کے کلام میں جو مختلف خوبیاں اور اوصاف ہیں اسی سے ان کا قد اپنے معاصرین میں بلند و بالا دکھائی دیتا ہے اور ہماری اس رائے کو تقویت مولوی عبدالحئی صفاؔ مولف تذکرہ شمیم سخن کی اس مختصر مگر جامع تحریر سے ملتی ہے:

''زمانۂ آخر میں ہر چند بہت سے شاعر ہوئے مگر صاحب کمال کا کلام ہمیشہ اپنا جلوہ علیحدہ ہی دکھاتا رہا۔ اس کا گواہ دیوان قلق ہے۔''

[کلیات قلق (جدید ایڈیشن) مرتب کلب علی خاں فائق۔ ص: ۵۸۷]

رباعیات:

جہاں تک رباعیات کا سوال ہے قلق نے مختلف موضوعات پر عمدہ رباعیات کہی ہیں۔ ان کی کلیات میں رباعیات کی کل تعداد ۱۴۲ ہے۔ ان رباعیات کو ہم مختلف موضوعات کے تحت رکھ سکتے ہیں۔

عشقیہ رباعی:

مجھ کو شب غم اے دل غم خوار نہ چھیڑ
رہنے دے بس اب قصہ اغیار نہ چھیڑ
داغوں سے سینہ رشک بال طاؤس
اے اشک نہ لے چٹکیاں ہر بار نہ چھیڑ

مذہبی رباعی:

روئے نبی عرض صفا کیوں ہوتا
اور آئینہ وحدت کا جلا کیوں ہوتا
معشوق کے جلوہ سے ہے پیدا عاشق
ہوتا نہ محمد تو خدا کیوں ہوتا

فلسفیانہ رباعی :

اس بزم کی طرفہ مہمانی دیکھی | ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے پھر بڑھاپا دیکھا | جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

بقول ڈاکٹر جلال انجم :

''اس رباعی کو بعض محققین نے سہواً میر انیسؔ سے منسوب کیا ہے
جو غلط ہے یہ رباعی قلقؔ میرٹھی کی ہے۔''

[قلقؔ میرٹھی۔ حیات اور کارنامے از جلال انجم۔ ص ۷۷]

سماجی رباعی :

یہ شہر بلند عالم بالا سے تھا | ہم شکل غرض جنت ماویٰ سے تھا
اب کیا ہے اک آبادی ریگستاں ہے | دہلی کو شرف قلعہ معلٰی سے تھا

قلقؔ میرٹھی میرٹھ آنے پر نوچندی میلے کے تعلق سے بھی رباعی کہتے ہیں۔

نوچندی کے میلے کا نہ پوچھ کچھ حال | ہوں دیکھ کے حیران کہ دوں کس کی مثال
یا روضۂ رضوان ہے سادہ سا مکاں | یا سیر سے میرا ہی منقش ہے خیال

ان رباعیات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جہاں قلقؔ کی رباعیوں میں فنی محاسن پائے جاتے ہیں وہیں ان کے متنوع موضوعات میں تازگی اور جدت کا احساس ہوتا ہے اور اس خوبی نے ان کو ایک معتبر رباعی گو بنا دیا۔

قلقؔ بحیثیت مرثیہ نگار :

فلق نے مرثیے زیادہ نہیں لکھے۔ان کے کلام میں صرف چار مرثیے ملتے ہیں ۔ایک مرثیہ ''واقعات کربلا'' سے متعلق ہے جو مسدس فارم میں ہے اور ۱۸۶ بندوں پر مشتمل ہے۔دیگر تین ذاتی اور شخصی مرثیے ہیں۔واقعات کربلا سے متعلق فلق کا مرثیہ اتنا پراثر اور عمدہ ہے کہ سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ اسے پڑھ کر تڑپ اٹھے :

''مرثیہ بھی لکھا تو اس زور کا کہ انیس و دبیر کو پرے بیٹھا دیا۔اچھے اچھے سنگ دلوں کو اپنی کیفیت بندی سے آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔''

[کلیات اردوئے فلق۔ص:۳۶۵]

مثال کے طور پر اس مرثیہ کی ''رخصت'' اور ''رزم نگاری'' پر نظر ڈالئے اور ایک واقعہ کی کیفیت کو محسوس کیجئے۔

یہ سنتے ہی جو شور اٹھا خیمہ گاہ سے　　دل قدسیوں کے ہل گئے بیواؤں کی آہ سے
کرسی و عرش آئے نظر بے پناہ سے　　شبیر سرنگوں ہوئے ذکر تباہ سے
کہتی تھیں شہ سے ہم کو یونہی چھوڑ جاؤ گے
سب آسروں کو توڑ کے منہ موڑ جاؤ گے

بھیا تمام چاہنے والوں کو رو چکی　　کم بخت ہوں کہ گود کے پالوں کو رو چکی
سینہ ہے داغ داغ کہ لالوں کو رو چکی　　باغ علی کے سارے نہالوں کو رو چکی
سنسان ہے جہان بھرا گھر کیا نثار

قربان جاؤں سب ہی کو تم پر کیا نثار

رزم نگاری:

نکلی وہ جب ذرا سی تو سارے سرک گئے   چمکی اس آب وتاب سے تارے سرک گئے

خورشید و ماہ ایک کنارے سرک گئے   عیسیٰ و خضر وہم کے مارے سرک گئے

نکلی تو ماہ چھوڑ کے ہالہ نکل گیا

گویا دل خموش سے نالہ نکل گیا

غرض اس مرثیے میں فصاحت وبلاغت کے جو دریا قلق نے بہائے ہیں وہ کسی بھی صفِ اول کے مرثیے نگار سے کم نہیں۔زبان کا استعمال بھی سادہ سلیس اور رواں ہے۔اس میں جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ رزمیہ نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں۔چہرہ،سراپا،رجز،رخصت،رزم اور بین سبھی موضوعات سے یہ مرثیہ مالا مال ہے۔

مسدّس:

کلیات قلق مسدس سے بھی خالی نہیں،لیکن کلیات قلق میں جو مسدس ملتے ہیں وہ ترجیع بند مسدس ہیں۔اس کے ہر بند میں ٹیپ کا شعر دہرایا گیا ہے۔ان کا پہلا مسدس سولہ بندوں پر مشتمل ہے۔اس مسدس کا ٹیپ کا شعر اتنا مقبول ہے کہ زبان عام پر آج بھی رواں ہے۔

امتحان دل بے تاب ہے گر جور سہی   نہ سہی عہد ترا غیر ہی کا دور سہی

پر ذرا صبر وتحمل پہ مرے غور سہی   اس پہ بھی قطع محبت ہے تو فی الفور سہی

تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی

تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

واسوخت:

واسوخت شاعری کی ایک صنف ہے جو واسُوختن سے بنا ہے۔ لغات کشوری میں واسوختن ایرانی شاعروں کی اصطلاح میں معشوق سے بیزار ہونا اور منہ پھیر لینا ہے۔ لیکن شاعری کی زبان میں اس کا مطلب معشوق کو 'جلانا' اور اس کی بے نیازی پر انتباہ کرنا ہے۔ اس صنف کے ذریعہ ہمارے شعرا کا یہ شعار رہا ہے کہ وہ معشوق کو جتاتے ہیں کہ اگر معشوق ان سے اسی طرح بے نیاز رہا تو وہ اس سے بھی زیادہ حسین اور خوش شکل معشوق سے دل لگا لیں گے۔ قلق کا واسوخت مثمن کے فارم میں ہے جس میں کل بند سترہ ہیں اور ہر بند میں چھ مصرعے ہم قافیہ ہیں اور پھر دو مصرعے دوسرے قافیہ میں ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو :

ہر چند تیرے تازہ خریدار بہت ہیں ۔۔۔ کیا چاہیں کہ اب یار کے اغیار بہت ہیں
پر یاد رہے میرے بھی غم خوار بہت ہیں ۔۔۔ غرفہ سے میری تاک میں طرار بہت ہیں
نایاب نہیں ایسے طرح دار بہت ہیں ۔۔۔ گلزار وفا میں گل بے خار بہت ہیں

کاشانہ حسرت میں اب اس شمع کو لاؤں
خاکستر پروانہ تجھے جس کا بناؤں

قلق کے واسوخت میں سادگی اور بے ساختگی کا جو امتزاج ملتا ہے وہ عریانیت سے پاک ہے۔ پورا واسوخت ڈرامائی ہے اور مکالماتی انداز میں بہت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ موضوعات کی پاکیزگی کا خیال رکھا گیا ہے، جس

سے ان کی انفرادیت نمایاں ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ فلق میرٹھی کی کلیات میں قطعات اور منظوم رقعات اور سات قصائد بھی موجود ہیں۔

فلق کی نثری کاوشیں

فلق نے باقاعدہ کوئی تصنیف تو نہیں چھوڑی مگر لاشعوری طور پر جو ان کی نثری کاوشیں ملتی ہیں وہ تین تقاریظ کی شکل میں موجود ہیں۔

پہلی تقریظ انہوں نے ''دیوان مومن'' ترتیب کرتے وقت تحریر کی جو فارسی زبان میں رقم کی گئی۔ دوسری تقریظ تذکرہ ''بہارستان ناز'' مولف حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی شاگرد غالب پر ہے جو خواتین شعراء کا تذکرہ ہے اور تیسری تقریظ غالب کے ان مکاتیب پر ہے جو ان کی زندگی میں ''عود ہندی'' کے نام سے شائع ہوئی۔

''بہارستان ناز'' کی تقریظ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سخن عجیب جادو ہے کہ سب کے سر پر چڑھ کے بولتا ہے اور ہر دل کی گرہ لب کشائی سے کھولتا ہے۔ یہی افسوس ہے یہی افسانہ ہے، یہی عاقل ہے یہی دیوانہ ہے۔ کہیں دعائے ماشو، کہیں دوائے مجبور، کبھی ترانہ انجمن، کبھی افسانہ انجمن، جادو اسی کا نام، معجزہ اس پر تمام، کبھی دشنام بن کے دل میں گھر کرتا ہے، کبھی پیام ہو کر مدنظر ہوتا ہے۔ الغرض زمانہ گنبد بے صدا ہے، یہی طلسم طلسم نما ہے، معشوقوں کو جس قدر اپنی خودداری پر ناز ہے اسی

قدر اس کو پزیرائی میں زار نالی نیاز، اور دولت مندوں کو جتنی بے پروائی نخوت ہے اتنی ہی اس کو سرمایہ اندوزی میں پامالی صحبت ہے۔"

[بہارستان ناز۔ از رنج میرٹھی ص۱۴۴ (جدید ایڈیشن) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء]

"عود ہندی" غالبؔ کے اردو خطوط کا مجموعہ ہے جو غالبؔ کی حیات میں شائع ہوا۔ یہ خطوط غلام غوث بے خبرؔ نے منشی ممتاز علی خاں کی فرمائش پر یکجا کئے۔ اس پر فلق میرٹھی سے تقریظ لکھنے کی فرمائش کی گئی جو بقول شوکت سبزواری "بہت بھاری بھر کم ہے" بطور نمونہ یہ اقتباس بھی دیکھئے :

"مآل ہر ذرہ ورائی وآشفتہ نوائی فلقؔ نا سنجیدہ بیان کج مج زبان کا یہ کہ اس ستودہ کیش قدر اندیش نے کس عمدہ عنوان سے فضیلۂ طبیعت مرزا غالبؔ یعنی خطوط ہائے پریشان اردو زبان کو روحِ رواں اور مغز جاں بنا دیا اور کس عبارتِ بے سر و پا سے کیسا باغستان معنی کھلا دیا۔ حق یہ ہے کہ ایسی سعی اور مشکور و محنت دراز و دور کون کس کے لئے کرتا ہے۔ ہر ایک اپنی جیب و گریبان کو گلہائے مقصود سے بھرتا ہے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے اور اس کا نام رابطہ خاص اور اخلاقِ عام ہے۔ جب طالبان زبان اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیں گے تو دلّی کا روزمرہ اردو اور محاورۂ گفتگو گھر بیٹھے سیکھ جائیں گے۔"

[عود ہندی۔ ص ۱۸۷]

مختصر یہ کہ جب فلق کی تقاریظ کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلی تقریظ فارسی میں ہے، دوسری تقریظ میں عبارت مقفّیٰ ہے اور قافیہ پیمائی بھی کی گئی ہے لیکن تیسری تقریظ جو عود ہندی کے نام پر رقم کی گئی ہے نسبتاً سادہ زبان میں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ خود غالب کے خطوط کی زبان سادہ تھی۔ ''عود ہندی'' سے فلق کے ادبی مرتبے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ غالب کسی ادنیٰ شخصیت سے تقریظ تحریر کرانے کے لئے تیار نہ ہوتے اور یہ ان کی عادت و مزاج کے خلاف ہوتا۔

فلق نے غالبؔ کے شایان شان اس تقریظ کو رقم کیا ہے۔ انہوں نے خطوط غالبؔ کے اسلوب کی وضاحت بڑی محنت اور جگر سوزی سے کی ہے لیکن ان معدودے چند نثری نمونوں کی بنیاد پر ان کی نثری کاوشوں پر ان کے نثری مقام کا تعین کرنا جانبداری ہوگی۔ البتہ فلق کی ادبی کاوشوں سے یہ نتیجہ ضرور اخذ ہوتا ہے کہ فلق میرٹھی اپنے دور کے ایک صف اول کے شاعر اور ایک عمدہ نثر نگار بھی تھے۔ جدید نظم کی صنف میں ان کا شمار اردو کے نظم جدید کے بنیاد گزاروں میں کیا جانا چاہئے۔ انہیں کے تراجم سے متاثر ہو کر مولانا اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ اور دیگر شعراء نے انگریزی شاعری خصوصاً نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کے پس رفتگاں نے اس ڈگر کو روشن کیا اور اس طرح سے جدید نظم کو نئی رفعت بخشی۔ اسی ڈگر پر فلق نے شاعری کا سفر جاری رکھتے ہوئے گیسوئے غزل کو سنوارا اور اسے اپنی فکر کی جدت سے متور کر دیا۔ لیکن اردو شعر و ادب کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اتنا بڑا شاعر بھی عرصہ دراز تک گمنامی

کے اندھیروں میں گم رہا اور اسے وہ قدر و منزلت نہ مل سکی جس کا وہ مستحق اور حقدار تھا۔

قلق میرٹھی غزل کی نزاکتوں اور اداؤں کو سنبھالنے کے ہنر سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی لئے ان کے کلام میں ایک ایک لفظ میں جذبات کی لہر موجزن معلوم ہوتی ہے اور منفرد رنگ و آہنگ اور خوشبو سے تغزل کے کیف میں اضافہ نظر آتا ہے۔ آخری بات یہ کہ یوں تو غزل کی دنیا میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ اور دیگر ہم عصروں کے مقابلہ قلقؔ شہرت میں ضرور پیچھے رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دیو قامت شعراء کے زمانے میں بھی قلقؔ کی قدر دانی خوب ہوئی اور ان کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ آج اردو شعر و ادب کا تقاضہ بھی ہے اور ضرورت بھی کہ قلقؔ میرٹھی کے فکر و فن اور شاعرانہ عظمت کا پھر سے محاسبہ کیا جائے۔ ہاں ان کی شعری و نثری خوبیوں کا دل سے اعتراف کرنے میں کسی کو ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔

باب سوم

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی

پیدائش: ۱۸۳۶ء   وفات: ۳۱/ مارچ ۱۸۸۵ء

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی

سوانح حیات

حکیم فصیح الدین رنجؔ کا خاندان بنی اسرائیل کہلاتا تھا۔ رنجؔ کے مورث اعلیٰ الحاج محمد ادریس بخندی تی شاہ طہماسپ کی ایما پر ہمایوں بادشاہ کی مدد سے ۱۵۵۵ء میں ایران سے ہندوستان آئے۔ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے نواب مجاہد الملک حاجی محمد ادریس بخندی کے پوتے شیخ محمد برخوردار کو ''خانی'' خطاب سے نوازا اور میرٹھ کے لہساڑی گیٹ علاقے میں ایک قطعہ زمین اپنی محل سرا تعمیر کرنے کے لئے عطا کیا۔ یہاں انہوں نے اپنے خاندان کے لئے مکانات بنوائے اور اس علاقہ کا نام ''محلہ بنی اسرائیل'' رکھا گیا جو کثرتِ استعمال سے بگڑ کر آج ''بنی سرائے'' کہلاتا ہے۔

رنجؔ کے دادا مولوی محمد طیب شمس الدین نے بوجہ جائداد سکندرآباد ضلع بلند شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس سلسلے میں مالک رام رقم طراز ہیں:

''شیخ قمر الدین رنجؔ کے والد محترم تھے۔ یہ خاندان اصل میں سکندرآباد ضلع بلند شہر کا رہنے والا تھا۔ جہاں سے رنجؔ کے

آباواجداد نقلِ مکانی کر کے میرٹھ چلے آئے تھے۔''

[تلامذہ غالب۔ مالک رام]

علاوہ ازیں ایک اور تحقیقی وتنقیدی مقالہ میں کچھ اس طرح کی شہادت ملتی ہے:

''شیخ شمس الدین کے پانچ بیٹے شیخ کریم الدین، شیخ امین الدین، حکیم محمد قمر الدین، محمد ضیاءالدین اور حکیم شرف الدین اور دو بیٹیاں قمرالنساء اور عظیم النساء تھیں۔ جن میں سے حکیم قمرالدین حکیم رنج کے والد تھے۔ان کی میرٹھ میں سکونت اختیار کرنے کی شہادت موجود ہے۔''

[حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی۔ ڈاکٹر راحت ابرار، ص۔۲]

اس سلسلے میں وہ حکیم قمرالدین کی وصیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں انہوں نے قصبہ فتح پور سیکری ضلع اکبرآباد کی اراضی کی وصیت حکیم فصیح الدین رنج کے نام کی ہے۔ اس وصیت میں انہوں نے خود کو ساکن 'میرٹھ' شہر لکھا ہے کلیات رنج کے 'قطعات تاریخیہ' سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ رنج کی رہائش محلہ 'بنی اسرائیل' شہر میرٹھ میں تھی۔ رنج کے والد حکیم قمرالدین کا انتقال ۱۸۸۳ء بمطابق ۱۲۹۹ھ میں ہوا۔ رنج نے اس پر تاریخ وفات کہی ہے۔

بودحیف از خسوف قمرالدین [۱۲۹۹ھ

رنج میرٹھی کی تاریخ پیدائش کا کسی تذکرہ نگار نے حوالہ نہیں دیا ہے لیکن ڈاکٹر راحت ابرار کا خیال ہے کہ ان کی پیدائش میرٹھ میں ۱۸۳۶ء میں ہوئی۔

تعلیم :

حکیم فصیح الدین رنج کی تربیت کا زمانہ میرٹھ میں گزرا۔ رنج کے دوست حافظ امداد حسین ظہور عرفانی نے کلیاتِ رنج کے خاتمے پر لکھا ہے:

> ''مصنف باکمال، مقبول ذوالجلال نے اپنے سن تمیز تک تحصیل علم و تکمیل فنون میں بسر کی۔ علم درس مولوی نصیر الدین مرحوم اپنے عم بزرگوار سے حاصل کیا تھا''۔
>
> [کلیات رنج، مطبوعہ ہاشمی پریس، ص۱۴۶]

طب کی تعلیم انہوں نے میرٹھ کے مشہور طبیب حکیم سعادت علی خاں سے حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں مالک رام لکھتے ہیں :

> '' عربی فارسی اور طب کی تعلیم اپنے حقیقی ماموں اور خسر مولوی نصیر الدین سے پائی جو ریاست 'دتیا' کی ملازمت ترک کر کے اپنے مکان پر مقیم ہو گئے تھے''۔
>
> [تلامذہ غالب : مالک رام]

معاشی حالات:

رنج کا ابتدائی زمانہ معاشی دشواریوں میں گزرا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں وہ میرٹھ سے باہر گئے۔ مثلاً علی گڑھ کا جانا ان کے تذکرے ''بہارستانِ ناز'' کے دیباچے سے واضح ہے۔ رنج کی تحریر سے اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر انگریزی سرکار سے وابستہ تھے۔ آگرہ کی ایک طوائف شاعرہ کا انہوں نے اس

طرح ذکر کیا ہے:

''اجلاسِ گورنمنٹی میں جو راقم کا جانا آگرہ ہوا تو وہ اس زمانے میں مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

[تذکرہ بہارستان ناز۔ مرتبہ حکیم فصیح الدین رنجؔ۔ طبع سوم]

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی اپنے عہد کے ممتاز اور اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد تھے۔ ماہر غالبیات مالک رام، امتیاز علی عرشیؔ، خلیل الرحمٰن داؤدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری وغیرہ رنج کو غالب کا شاگرد مانتے ہیں۔ رنجؔ کے معاصرین کی تحریریں بھی رنجؔ کو غالبؔ کا شاگرد ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائی کے بعد پہلی مرتبہ مرزا غالبؔ کا دیوان مطبع واقع شاہدرہ دہلی سے ۱۲۷۷ھ باہتمام مولوی محمد حسین شائع ہوا تھا۔ اس دیوان کی اشاعت پر فصیح الدین رنجؔ نے قطعہ تاریخ لکھا ہے جس میں خود کو شاگرد غالبؔ کہا ہے:

''قطعہ تاریخ دیوان ریختہ (اوستاذی سلمہٗ اللہ تعالیٰ)

مست کہتے ہیں یوں مزا چکھ چکھ

کیا شباب دو آتشہ ہے واہ

[۱۲۷۷ھ]

''خم خانہ جاوید'' کے مصنف لالہ سری رام، رنجؔ کے دیرینہ رفیق محمد وزیر خاں وزیرؔ، شاگرد غالب منشی تفضل حسین، میرٹھ کے ممتاز شاعر امداد حسین ظہور عرفانیؔ، ممتاز محقق خلیل الرحمٰن داؤدی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی فصیح الدین رنجؔ کو شاگرد

غالب ہی بتایا ہے۔

یہ بات بھی یہاں ذہن نشیں رہے کہ مرزا غالبؔ کا میرٹھ سے خصوصی تعلق رہا ہے۔نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کا شمار غالبؔ کے مخصوص احباب میں ہوتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط سے غالبؔ کا تین مرتبہ میرٹھ آنا ثابت ہوتا ہے۔غالبؔ کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' بھی میرٹھ ہی سے شائع ہوا تھا۔یہ مجموعہ ۲۷؍اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مرزا غالبؔ کی وفات سے چار ماہ قبل 'مجتبائی پریس' سے شائع ہوا تھا۔غالبؔ کی ادبی تنقید کی ابتدا بھی میرٹھ سے ہوئی۔رنجؔ کے دوست مولانا رحیم بیگ رحیمؔ میرٹھی نے ''قاطع برہان'' کے جواب میں ''ساطع برہان'' ۱۸۶۵ء میں شائع کیا جس کا جواب غالبؔ نے دیا اور اسی کو 'نامہ غالب'' کا نام دیا گیا ہے۔کلام غالبؔ کے سب سے پہلے شارح شوکتؔ میرٹھی تھے جنہوں نے بقول شوکت سبزواری :

''بعض بعض اشعار کے سات سات مطالب بیان کئے ہیں۔''

[دبستان میرٹھ (مخطوطہ) مشتاق شارق مرحوم]

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی کی اولاد میں صاحبزادے حکیم فخر الدین اور دو لڑکیاں تھیں۔ان کی اولاد میں صدر جمہوریہ ہند کے اعزازی معالج پدم شری حکیم سیف الدین احمد اور ان کے صاحبزادے حکیم سراج الدین اور معراج الدین آج بھی ''بنی سرائے'' میں رہتے ہیں۔رنجؔ کا انتقال ۳۱؍مارچ ۱۸۸۵ء کو دوشنبہ کے دن ہوا۔رنجؔ کے دیرینہ رفیق جارج پیش شورؔ نے سنِ ہجری اور رنجؔ میرٹھی کے صاحبزادے حکیم فخر الدین فخرؔ نے سن عیسوی میں تاریخ وفات نکالی ہے۔

خوشی شور کی لے گئے اپنے ساتھ
نصیب اس کو ہے اب غم رنجؔ آہ

[۱۳۰۲ھ (شورؔ)]

ازلب، یگاں بگاہ بگفت۔ آہ رنجؔ در گزشت

اس سے ۱۸۸۵ء برآمد ہوتا ہے۔

انتقال کے وقت رنجؔ کی عمر ۴۹ سال تھی۔ وہ اپنے آبائی قبرستان شاہ سلطان بیرون لِھساڑی گیٹ میرٹھ میں مدفون ہیں۔

رنجؔ میرٹھی کی ادبی خدمات:

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد، اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار، جدید نظم نگاری کے امام، غزل گو، قصیدہ نگار، قطعات اور مرثیہ نگار حکیم فصیح الدین رنجؔ کے کارنامے ان کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم شخصیت قرار دیتے ہیں اور انہی خدمات اور کارناموں کے ذریعہ ہم ان کی قدر و قیمت کا تعین آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آیئے ان کی ادبی حیثیت کو ان کارناموں کے حوالے سے قائم کریں جو انہیں اور ان کی شخصیت کو دوام بخشتے ہیں۔

رنجؔ بحیثیت تذکرہ نگار

فصیح الدین رنجؔ میرٹھی اردو ادب و زبان کے وہ اولین تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اردو شاعرات کے کلام کو جمع کیا اور اسے اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ اس گراں قدر کام کے لئے ہی انہیں اردو تذکرہ نگاری میں تاریخی حیثیت حاصل ہو جاتی

ہے۔

اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں صرف چھ تذکرہ نگار ایسے گزرے ہیں جنہوں نے شاعرات کے کلام کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ ان میں فصیح الدین رنجؔ کا تذکرہ 'بہارستانِ ناز'، 'نسوانِ ہند'، درگا پرشاد نادرؔ دہلوی کا تذکرہ 'چمن انداز'، مولوی عبدالحیٔ صفاؔ بدایونی کا تذکرہ 'شمیم سخن'، مولوی عبدالباری آسیؔ اُلدنی میرٹھی کا تذکرہ ''تذکرۃ الخواتین'، مولوی محمد عباس کا 'تذکرۃ النساء' خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں لیکن فصیح الدین رنجؔ کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اردو شاعرات کا تذکرہ اردو ادب میں پہلی بار پیش کیا۔ یہ تذکرہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع دارالعلوم میرٹھ سے با اہتمام منشی وجاہت علی شائع ہوا۔ دوسرے تمام تذکرہ جات بارہ سال بعد یعنی ۱۸۷۶ء کے بعد تحریر کیے گئے۔

''بہارستان ناز'' سے قبل اردو شاعرات کا تذکرہ دوسرے تذکروں میں ضمناً آجاتا تھا۔ یعنی اردو شاعرات کا کوئی علیحدہ تذکرہ پہلے مرتب نہیں تھا۔ غلام ہمدانی مصحفیؔ نے پہلی بار اپنے ''تذکرہ ہندی'' میں پانچ شاعرات کا ذکر الگ سے کیا ہے۔

فصیح الدین رنجؔ کا دور دراصل اردو ادب کے نشاۃ الثانیہ کا دور تھا۔ ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ راجہ رام موہن رائے فرسودہ رسم و رواج کے خلاف بنگال میں آواز بلند کر رہے تھے۔ انہوں نے عورتوں کو جائداد میں حق دلانے، تعلیم نسواں اور ستی کے خاتمے کے لئے مہم چلائی۔ ان کی اس اصلاحی تحریک سے ہی ہندوستان میں 'ادبی نشاۃ الثانیہ' کا آغاز ہوا۔ رنجؔ میرٹھی اور ڈپٹی نذیر احمد سے

قبل عورتوں کے کارناموں کو اہمیت کی نگاہوں سے دیکھنا مردوں کی عظمت اور برتری کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ رنج نے مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا۔ ان کے عہد میں عورتوں کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی حیثیت اور مرتبے پر ظلمت کے بڑے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دنیا کی نظروں سے دور رکھنا سماجی وقار کے لئے ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ رنج کو خواتین اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی تھی، چنانچہ اپنے تذکرے کے دیباچہ میں انہوں نے علم کی فضیلت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے عورتوں میں تعلیم کے فقدان پر اس طرح سے اظہار افسوس کیا ہے۔

> ''بڑی دلچسپ اور افسوس کی بات ہے اور نہایت ہی حسرت کا مقام ہے کہ باوجود ایسے فضائل و شرائف کے خدا جانے مستوراتِ ہند کو تحصیلِ علم میں کیوں کلام ہے۔''

اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں :

> ''کاش یہ لوگ آٹھ پہر میں ایک ایک وقت میں بھی عمر صرف حصولِ علم و ہنر کریں، گاہے گاہے وہ وادیٔ تحصیل میں گزر کریں تو بھی رفتہ رفتہ جہل مرکب دور ہو جائے گا۔ اس فرقے کا عیب بالکل مستور ہو جائے، معاملات وعبادات میں اچھی طرح خبردار ہوں، دیدہ دانستہ ضلالت میں پھنس کر گنہگار نہ ہوں۔ طرّہ اور یہ ہے کہ جو لوگ ان کے وارث اور والی ہیں کبھی ان کی تربیت کا

خیال نہیں، ان ناقصوں کو ہرگز قدر کمال نہیں، حالانکہ سرکار کا یہ فیض عام اب ہر جگہ جاری ہے۔ کوئی شہر و قصبہ ایسا نہیں جہاں اسکول اور مدرسہ کی تیاری نہیں ہے۔ مستورات کی تعلیم کی وجہ سے علیحدہ مدرسے کی تعمیر و ترتیب ہے۔ ایک ایک علامہ ذی فن فخر لندن وہاں پر معلم و ادیب ہے۔ اگر یہ لوگ اس حال میں بھی اس دولت سے محروم رہ جائیں تو نہایت عجب ہے بلکہ میری دانست میں یہ بھی ایک خدا کا غضب ہے''۔

[تذکرہ بہارستان ناز: مرتبہ حکیم فصیح الدین رنج۔ طبع سوم]

اسی زمانے میں مصحفی کا کلام رنج کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور یہی سبب شاعرات کے کلام کی جانب رنج کی توجہ مبذول ہونے کا بنا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف تذکروں اور کتابوں کا مطالعہ کیا جن کا ذکر ''بہارستان ناز'' میں موجود ہے۔ چونکہ شاعرات کا کوئی تذکرہ رنج کو دستیاب نہ ہوا شاید اسی خیال سے رنج نے شاعرات کا تذکرہ تحریر کرنے کی ضرورت اور تقاضے کو محسوس کیا ہوگا۔ ہماری اس فکر اور سوچ کو ذیل کے اقتباس سے تقویت ملتی ہے۔

''بعض احبائے صادق الوداد نے اس تالیف میں حد سے زیادہ اصرار کیا۔ ہر دم اس بات کا مذکور رہا، ہر صحبت میں یہی دستور رہا۔ جب دو چار آشنا ایک جا ہو جاتے، خود اشعار پڑھتے، مجھ سے لکھواتے، جب دوستوں کا اصرار حد سے زیادہ ہوا، چار و نا چار

عاجز اس امر پر آمادہ ہوا، جہاں تک ہوسکا جستجو میں اہتمام کیا، بہت تلاش سے مستورات کا پیدا کلام کیا۔ بعض کا کلام کتب قدیم میں پایا، اکثر بذریعہ احباب وارباب کے ہاتھ آیا۔ جب اس طرف سے فرصت پائی، بقیہ حروف تہجی ہر شاعرہ کی فہرست بنائی۔ ترتیب وتالیف کا بہ خوبی انجام ہوا، 'بہارستان ناز' اس تذکرے کا نام ہوا''۔

[تذکرہ بہارستان ناز: مرتبہ حکیم فصیح الدین رنج، طبع سوم]

'بہارستانِ ناز' مطبع دار العلوم میرٹھ سے پہلی بار باہتمام محمد وجاہت علی وجاہت ۱۸۶۴ء مطابق ۱۲۸۱ھ شائع ہوا۔ ممتاز محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی اس پہلے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ تذکرہ حکیم فصیح الدین رئیس میرٹھی کی تالیف ہے۔ مولف نے اس کی تالیف کا کام سید علی رئیس میرٹھ کی فرمائش پر انجام دیا تھا۔ سبب تالیف کے بعد شاعرات کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی دی گئی ہے۔ یہ غالباً اس تذکرے کا پہلا ایڈیشن ہے جو صرف ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ دو صفحے قطعات تاریخ سے متعلق ہیں۔ خاتمہ الطبع یہ ہے ''تاریخ بستم شہر جمادی الثانی ۱۲۸۱ھ بست ویکم ماہ نومبر ۱۸۶۴ء ختم ہو کر مطبع دار العلوم میرٹھ باہتمام وجاہت علی خاں

صاحب مہتمم اخبار عالم نواز دہم ماہ دسمبر ۱۸۶۴ء مطبع ہوا"۔

[رسالہ تذکرات ازگارساں دتاسی، ترجمہ مولانا ذکاء اللہ، مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی ص ۱۱۰]

طبع دوم :

طبع اول اغلاط سے پر تھا۔ جارج ارنسٹ وارڈ جوائنٹ مجسٹریٹ میرٹھ اور مسٹر اسمٹ صاحب مہتمم بندوبست علی گڑھ تھے۔ انہی دنوں انگریز حکام نے طبع دوم کی اشاعت کے اخراجات بھی برداشت کیے اور ان ہی کے اصرار پر رنج نے اس پر نظر ثانی کی۔ دوسری بار یہ مطبع دارالعلوم میرٹھ سے باہتمام محمد وجاہت علی خاں اپریل ۱۸۶۹ء مطابق محرم ۱۲۸۶ھ شائع ہوا۔ اس بار صفحات کی تعداد ۳۸ کی بجائے ۷۶ تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری 'بہارستان ناز' کے اس تعلق سے لکھتے ہیں :

> "یہ اردو شاعرات کا پہلا تذکرہ ہے اور اردو زبان میں ہے۔ درگا پرشاد نادر کا تذکرہ شاعرات" چمن انداز"، "بہارستان ناز" کی دو اشاعتوں ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۹ء کے بعد ۱۸۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس لئے اردو شاعرات کے اولین تذکرہ نگار فصیح الدین رنج میرٹھی ہی قرار پائے۔ شاعرات کا تذکرہ بہ لحاظ حروف تہجی کیا گیا ہے۔ تراجم اور منتخبات دونوں میں تقریباً توازن ملتا ہے۔ یعنی دوسرے تذکروں کی طرح یہاں تراجم بہت مختصر اور منتخبات بہت طویل نہیں ہیں بلکہ دونوں کو تقریباً مساوی جگہ دی گی ہے۔"

[اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ ص: ۳۶۰، ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، مجلس ترقی ادب، لاہور]

طبع سوم :

تذکرے کی تیسری اشاعت آخری مرتبہ مولف کی زندگی ہی میں ۱۸۸۳ء بمطابق ۱۲۹۹ھ میں عمل میں آئی۔ اس بار یہ مطبع عثمانی میرٹھ باہتمام منشی ظلم الدین خاں شائع ہوا۔ طبع سوم میں صفحات کی تعداد بڑھ کر ۷۶ سے ۱۱۴ ہوگئی۔ اس طرح یہ آخری اور مکمل صورت میں ہے۔ اس میں ۴۶ شاعرات کے منتخب کلام میں فارسی اشعار دیئے گئے ہیں۔ تین شاعرات کے انتخاب میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار ملتے ہیں۔ باقی ۱۲۵ شاعرات کے حوالے سے صرف اردو کلام ہی دیا گیا ہے۔

رنجؔ میرٹھی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی تحریروں میں اکثر و بیشتر شوخ بیانی اور رنگینیٔ زبان کے جلوے پائے جاتے ہیں۔ طرز تحریر میں ابتدا سے انتہا تک دلآویزی کے ساتھ ہمواری بھی پائی جاتی ہے۔

بقول راحت ابرار :

''رنجؔ کی نثر اتنی دلآویز ہے کہ اس کے سامنے نظم ہیچ نظر آتی ہے۔''

[اردو شاعرات کا اولین تذکرہ نگار، حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی، از ڈاکٹر راحت ابرار۔ ص ۱۲۲]

شاعرات کے کلام کے انتخاب میں رنجؔ کی بالغ نظری اور بلند مذاق ہر جگہ نظر آتی ہے اور ان کے انداز تحریر کی شگفتگی اور شوخی کتاب کو اردو کے نثری ادب میں شہ پارے کا مقام عطا کرتی ہیں۔ رنجؔ کے عہد میں تذکرہ نگاری کے فن تحقیق کی کوئی راہ

متعین نہیں ہوئی تھی مگر ان کے تذکرے کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ رنج نے شاعرات کے کلام اوران کے حالات کوجمع کرنے میں بہت تلاش وجستجو سے کام لیا۔

وہ تحریر فرماتے ہیں :

> " جہاں تک ہو سکا جستجو میں اہتمام کیا۔ بہت تلاش سے مستورات کا پیدا کلام کیا۔ بعض کا کلام کتب قدیم میں پایا اکثر بذریعہ احباب وارباب ہاتھ آیا"۔

[تذکرہ بہارستان ناز: مرتبہ حکیم فصیح الدین رنج طبع سوم]

یہ تلاش وجستجو ہی درحقیقت آج کی تحقیقی کاوش ہے۔

تنقیدی نظر:

انہوں نے اپنے تذکرے میں شاعرات کے حالات وکوائف کے علاوہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ رنج اُن تذکرہ نگاروں میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں جنہوں نے اردو میں ادبی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک بے لاگ نقاد تھے۔ انہوں نے متعدد شاعرات کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا بیباکانہ اظہار کیا ہے اور کسی مروّت سے کام بھی نہیں لیا۔ انہوں نے ہر شاعرہ کے کلام کو پڑھا، پرکھا اور تنقیدی شعور کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(۱) امیرؔ کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں:

> " ایک مطلع کے سوا باقی کلام اس کا بکائن کا پھول ہے۔"

(۲) امیر خانؔ کے لئے لکھتے ہیں:

”یہ شعر جو درج ذیل ہے اگر چہ اس کے نام سے منسوب
ہے مگر اس کی طبیعت سے فصاحت کوسوں دور ہے۔“

(۳) میرؔ کے لئے ستائشی کلمات کچھ اس طرح ہیں:

”اشعار کے مصارع ایسے کسی کے دست و گریباں نہیں ہیں جیسے
ان کے ہیں۔ سبحان اللہ چستی الفاظ و بندش مضامین میں ان کا
جواب نہیں۔ ان کے کلام سے اشعار کے لئے حاجت انتخاب
نہیں۔“

(۴) نزاکت بازار نشیں، بمبئی کے لئے فرماتے ہیں:

”یہ غزل اپنے نزدیک یہ پیرانہ خواب غزل، بی مشتری لکھنوی
مشتہر کی تھی۔ کہاں ذرہ کہاں آفتاب، کہاں نزاکت کے
بھدّے اشعار، کہاں مشتری کی غزل کا جواب۔“

بیگم رنگ محل بیگم کے بارے میں انہوں نے دل، گلاب، چہرہ اور نقاب کا ذکر کر کے
اس عہد کی سچائی اور حقیقت کو اپنی تحریروں میں کچھ اس طرح زبان دی ہے:

”رنگ محل نام، ریختی میں دستگاہ تمام، حالانکہ خود پنجاب کی رہنے
والی ہے مگر اپنی زبان بالکل قلعہ کی بنالی ہے۔ کلکتہ میں بوجہ عقد واجد
علی شاہ کی ہمرکاب ہے، دل ابھی بھی کھلا ہوا گلاب ہے مگر چہرہ
بزیر نقاب ہے۔“

رنجؔ میرٹھی کا یہ تذکرہ محض شاعرات کے کلام کا نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ تعلیم

نسواں کا پہلا منشور بھی ہے، کیوں کہ سب سے پہلے حکیم صاحب نے ہی تعلیم نسواں کی ضرورت پر زور دیا۔ رنج کے اس فکر کی بنیاد پر ہی ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں مسلم خواتین کے مرتبے کو تسلیم کیا اور خواجہ الطاف حسین حالی نے مجالس النساء لکھ کر تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی۔ خود سر سید احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی کے پہلے لیکچر میں عقد بیوگان اور تعدادِ ازدواجات کے سلسلے میں مروجہ رسموں کو دور کرنے پر خصوصی توجہ دی۔ اس طرح رنج نے سب سے پہلے ۱۸۶۴ء میں تعلیم نسواں کے فروغ کو اپنے تذکرے کی تالیف کا جواز بنایا۔ غرض کہ رنج کا تذکرہ ہندوستان میں خواتین کی تعلیمی بیداری کا محرک ثابت ہوا اور اس طرح رنج نے شاعرات کے کلام کو ضائع ہونے سے بچایا۔

رنج اپنی تذکرہ نگاری کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ اس فن میں رنج کی شہرت نہ صرف ملک بھر میں تھی بلکہ ملک کی سرحد کے باہر بھی وہ ایک قابل احترام تذکرہ نگار تسلیم کئے جاتے تھے۔ خاص طور سے اہل یورپ کی دلچسپیاں ہندوستان کی شاعرات کے بارے میں بہت زیادہ تھیں۔ پروفیسر ثریا حسین کے مطابق گارساں دتاسی کے کتب خانہ میں رنج میرٹھی کا تذکرہ "بہارستان ناز" ۱۸۶۹ء میں موجود تھا۔ اس سے بھی "بہارستان ناز" کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

جدید نظم کے ارتقاء میں رنج کا حصہ

ملک کے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور تمدنی حالات کے تحت جب ایک نئے علمی اور ادبی دور کا آغاز ہوا تو قدیم شعری روایت اور اصناف کو اس نئی روایت اور

نئی اصناف کے لئے جگہ چھوڑنی پڑی۔ رنج ذہنی وفکری، شعوری اور سماجی اعتبار سے زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں سے متاثر تھے۔ جدید نظم کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا اور انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے ساتھ ساتھ رنج میرٹھی بھی جدید نظم نگاری کو نئی جہت عطا کرنے میں معاون ومددگار رہے۔ ان کے دور میں معاشرے اور تہذیب ہی کی نہیں بلکہ ادبی اقدار کی بھی تبدیلی کا آغاز ہو رہا تھا۔ مغربی ادب کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوتا جا رہا تھا کہ اسے اپنائے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ رنج نے اپنی شاعری کے وسیلے سے مشرق ومغرب کے درمیان موجود فاصلوں کو کم کیا اور اردو داں طبقے کے ذہنوں کو نئے علوم سے روشناس کرایا اور نئے خیالات کی طرف موڑا۔ انہوں نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مغرب کی عقلیت پسندی کو تسلیم کیا، اس لئے ان کے تنقیدی شعور اور فہم وادراک میں بالیدگی اور پختگی پائی جاتی ہے۔

ان ہی دنوں انجمن پنجاب کے مشاعروں میں طرحی غزل کی بجائے مختلف قومی واخلاقی موضوعات پر نظمیں لکھنے پڑھنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ انجمن کے یہ مشاعرے اردو شاعری میں بڑے انقلاب کا باعث بنے۔ ان سے نہ صرف نئی شاعری کے فروغ اور ارتقاء کو تقویت ملی بلکہ ایک بڑے انقلاب کے ساتھ ساتھ ادب وشعر کی دنیا میں بھی ایک نئی سوچ اور نیا زاویہ نگاہ ابھر کر سامنے آیا۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے ساتھ ساتھ فصیح الدین رنج نے بھی ان مناظموں میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صفیہ تمنائی کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انجمن پنجاب کا چھٹا مشاعرہ ۱۴ر نومبر ۱۸۷۴ء کو منعقد

ہوا تھا۔ جس کا عنوان ''انصاف'' تھا۔ اس مشاعرے کی رپورٹ کوہ نور ضمیمہ ماہ اکتوبر نمبر ۵ میں شائع ہوئی۔ جس میں حسب ذیل شعرا نے شرکت کی:

''مولوی فصیح الدین رنجؔ، مولوی محمد شریف (مہتمم اخبار طلسم حیرت۔ مدراس)، رام داس قابلؔ (فارسی)، منشی لچھمن داس پریمؔ، میر انور حسین، منشی اصغر علی حقیرؔ، ملا گل محمد عالیؔ، منشی شیخ الٰہی بخش رفیق، امام بخش (رئیس بٹالہ فارسی) مولوی عطا خان عطاؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد حسین آزادؔ اور پنڈت رتن لال۔''

[نقوش سالنامہ لاہور ''انجمن پنجاب کے مشاعرے'' ڈاکٹر صفیہ تمنائی]

کلیات رنجؔ میں ایک قصیدے کے ذریعہ رنجؔ کی انجمن پنجاب کے مشاعروں میں شمولیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مشاعرے کی صدارت لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب نے کی تھی۔ کلیات رنجؔ میں یہ قصیدہ بعنوان ''قصیدہ درتہنیت انعقاد مشاعرہ تہذیبی لاہور بحضور نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب'' موجود ہے۔ اس مشاعرے میں بولنوز صاحب میگائن اور کرنل ہالرائیڈ بھی موجود تھے۔ قطعہ حاضر ہے:

ملی ہے اب رہ کوئی مزاج دان سخن
دکھائے گورنمنٹ کو نزاکتِ فن
بہت دنوں میں ہوئی منزلت سخن کو نصیب
کہ آج بزم میں بیٹھے ہیں قدردانِ سخن
مشاعرے کا ہوا انعقاد با تہذیب

خوشی سے پھول گئے اہل فن نحیف بدن

میری بھی رائے میں اس عمدہ نظم کی کیا بات

کہاں وہ چرک بدن اور کہاں یہ مشک ختن

پرانی نظم کی صورت بدل گئی بالکل

نئے جو رنگ کا پہنا ہے اس نے پیراہن

نہیں ہے رنگ قدیمی کی شاعری محتاج

خیال نو کو نہیں جستجوئے رنگ کہن

اگر رہا یونہی چندے یہ جلسۂ حکام

تو ہو نہ جائے گا لاہور حسرت لندن

یہاں تو صدر نشیں بولنوز صاحب ہیں

کہ جن کی نیکی کو سن کر فلک کہے احسن

وحید عصر ہیں کرنل میگائن صاحب بھی

رموز دانِ سخن اور واقف ہر فن

جناب بیگ بہادر و ہالرائڈ ہیں

کہ ہیں یہ دونوں فضیلت کی معدن و مخزن

بدلتا رہتا ہے اے رنج رنگِ لیل و نہار

کبھی ہے شام مسرت کبھی ہے صبح محن

مذکورہ قصیدے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی فصیح

الدین رنج انجمن پنجاب کے جلسوں و مشاعروں میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد انجمن پنجاب کی شاخ قائم کرنے کے لئے میرٹھ بھی آئے تھے لیکن انجمن پنجاب کے قیام سے قبل ہی یعنی ۱۸۶۳ء میں میرٹھ کے شاعروں نے نظم سوسائٹی قائم کرلی تھی۔ شہرت بخاری نے محمد حسین آزاد کے میرٹھ کے سفر کے بارے میں مزید معلومات اس طرح سے فراہم کی ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے میرٹھ کا سفر شاید خاص طور سے اختیار کیا اور اپنی مثنوی "امید" اسی جلسے میں پڑھی اس کا مطلب ہے آزاد نظم گوشاعری میں ایک ملک گیر تحریک بنانے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر خود انجمن پنجاب دس سے زیادہ مشاعرے نہ کرسکی۔ یہ مشاعرے بند ہو گئے مگر جو بیج ڈالا گیا تھا وہ ایک عظیم درخت بن کر رہا۔"

[سالنامہ نقوش لاہور۔ادبی تحریکیں،شہرت بخاری]

آزاد نے جدید شاعری کی عمارت کے لئے جو نقشہ پیش کیا تھا اور جن لوگوں نے اس عمارت کی تعمیر کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں کئی نام آج بھی زندہ ہیں۔ انہیں میں سے ایک نمایاں نام رنج میرٹھی کا بھی ہے جنہوں نے آزاد کے نظریے کو تقویت بخشی۔ اس حیثیت سے رنج کا مرتبہ آج بھی بلند و بالا نظر آتا ہے۔

رنج بحیثیت نعت گو

مولوی فصیح الدین رنج نے اپنی شاعری کا آغاز نعتیہ کلام سے کیا۔ ان کا پہلا

نعتیہ مجموعہ ۱۸۶۰ء میں "گلشن نعت" کے نام سے شائع ہوا۔ رنج نے یہ نعتیہ کلام اپنے ایک دیرینہ رفیق نظام الدین جوش کتب فروش کول (علی گڑھ) کی فرمائش پر در مطبع آئینہ سکندر میرٹھ میں ۲۵ جمادی الاول ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۶۰ء با اہتمام امداد علی چھپوایا تھا۔ اس نعتیہ مجموعے میں خود مصنف کا ایک قطعہ تاریخ درج ہے۔

مرے قلم سے مرتب ہوا یہ گلشن نعت
کہ رنج پڑھنے سے اس کے دل ملول کھلے
سنی یہ میں نے لب ابر فیض سے تعریف
عجیب گلشن نعت نبی کے پھول کھلے

[۱۲۷۶ھ]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کے قدم پوری طرح جم گئے تھے اور حکومت ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اب انگریز پادریوں نے اپنی مذہبی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ عیسائی مشنریوں کا ایک سیلاب سا آگیا جس نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ عیسائی مبلغ سرکاری افسران کی سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور حکومت ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ عیسائی مبلغ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو پریشان اور ان کے مقدس مقامات کی ہر ممکن بے حرمتی کرنے میں لگے تھے۔ اس غیر شائستہ انداز اور برہنہ زبان کا اصل نشانہ اس وقت صرف مسلمان اور اسلام تھا کیونکہ انگریزوں سے قبل ہندوستان پر مسلمان ہی حکومت کر رہے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں پر مایوسی اور انحطاط کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات اور زوال پذیر معاشرہ کا اثر ادیبوں اور شاعروں پر بھی پڑا جس سے اس عہد کا ماحول مذہب وتصوف کے لئے سازگار ہوا۔ رنجؔ میرٹھی کی شاعری کا ایک مخصوص حصہ مذہب وتصوف بھی ہے۔ وہ اپنے دور کے ایک ممتاز نعت گو شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ بحیثیت نعت گو ان کی شہرت کا جب ڈنکا بجا تو ان کے نعتیہ کلام کے مجموعے کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اہل زبان وادب نے اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

رنجؔ کے دور میں غزل اور قصیدے کی طرح نعت بھی اردو شاعری کی ایک اہم صنف بن چکی تھی۔ ان کے معاصرین بھی نعت کہہ رہے تھے اور نعتیہ دیوان بازار میں خوب آرہے تھے۔ امیر مینائی، داغؔ دہلوی، محسنؔ کاکوروی اور رنجؔ میرٹھی نعتیہ کلام کے ممتاز شعرا تھے اور ان سب کا لہجہ بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ حافظ امداد حسن ظہور عرفانیؔ کا دیوان ''ظہور رحمت'' اور اور وزیر خاں کا نعتیہ دیوان اس کی چند مثالیں ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کی نعتیہ شاعری کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا اکبر وارثی میرٹھی کے ''میلاد'' تو گھر گھر میں آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ اس لئے اس دور کو نعت کا دور کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس دور نے نعت کے لئے سب سے زیادہ سازگار ماحول بنایا۔ دراصل اس وقت شعرا نعت سے اخلاقی تلقین اور سماجی اصلاح کا کام لے رہے تھے۔

رنجؔ میرٹھی بنیادی طور پر خدا پرست انسان تھے۔ ان کا عقیدہ اور ایمان

بہت پختہ تھا اور عقیدہ ہی در حقیقت ان کی نعت کی جان ہوتا ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں رسول اکرمؐ سے قلبی وابستگی کا احساس پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں قدسی کی غزل میں خمسہ، ملا جامی کی نعتیہ غزل کے انداز پر مخمس اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرز پر مخمس کہے ہیں۔

چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

اٹھاتا ہوں قلم اے رنج بسم اللہ کہہ کر میں
سخن مقبول عالم کیوں نہ ہو نام خدا میرا

بت خانے سے گھبرائے تو کعبہ سے بندھا دھیان
بت ظلم جو کرتے ہیں تو آتا ہے خدا یاد

محمدؐ کی مرضی ہے مرضی خدا کی
خدا کی رضا ہے رضائے محمدؐ

ہو خواب میں جو رنج زیارت رسول کی
اختر ہو اوج پہ میرے بختِ سیاہ کا

لگاؤں میں آنکھوں میں سرمے کے بدلے
ملے گر مجھے خاک پائے محمدؐ

عطا کر الٰہی تو اس کی تمنا
کہ ہے رنج بھی خاک پائے محمدؐ

تمہاری ذات خدا کی قسم ہے لاثانی

جو تم نہ ہوتے نہ ہوتا یہ عالم فانی
تمہاری جس پہ عنایت کی ہو نظر ثانی
نہ سمجھے پست. وہ کیوں رتبہ سلیمانی

مولانا شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدین دہلوی کا قران پاک کا ترجمہ ''جواہر القرآن'' کے نام سے میرٹھ کے مطبع زیب مجتبائی نے جب ۱۲۸۸ھ میں دوبارہ شائع کیا تو رنج میرٹھی نے اس کا دیباچہ لکھا۔ یہ دیباچہ رنج کے مذہبی افکار و نظریات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ رنج نے اس ترجمہ کی اشاعت پر ایک تاریخی قطعہ بھی کہا ہے جس کے دو شعر دیکھیے :

طبع جب یہ کلام پاک ہوا
نور افزا ہوا میرا ایماں
سر زندیق کاٹ دل نے کہا
یہ مترجم جواہر القرآں
[۱۲۸۸ھ]

رنج بحیثیت روایتی شاعر

رنج بحیثیت غزل گو:

حکیم فصیح الدین رنج کا دور قدیم اور جدید کے امتزاج کا دور تھا۔ غالب، ذوق، شیفتہ، ظفر کا آخری زمانہ تھا۔ داغ اور امیر مینائی شاعری میں اپنے کمالات کا ڈنکا بجا رہے تھے۔ دوسرے محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی جدید شاعری کی

ترویج واشاعت میں سرگرم تھے۔ رنج میرٹھی کی تعلیم وتربیت مشرقی ماحول میں ہوئی مگر وہ زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں سے متاثر تھے۔ مشرقی شعری روایت کے ساتھ ساتھ وہ مغربی علوم وفنون کے پرستار تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی شاعری میں روایت اور جدید رجحانات کو خوب برتا۔ اس طرح ان کی شاعری میں قدیم وجدید خیالات کا ایک دریا موجزن ہے۔ ان کی غزلوں میں ان کے معاصرین غالبؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مومنؔ، امیرؔ مینائی، داغؔ، ذوقؔ اور حالیؔ، کا رنگ جھلکتا ہے۔ راحت ابرار نے اس نکتہ کو کچھ اس انداز سے نمایاں کیا ہے:

> ''رنجؔ میرٹھی کی ہمہ گیر طبیعت کسی ایک رنگ کی پابند نہیں ہوئی بلکہ اس نے تمام رنگوں کے اثرات قبول کئے۔ یہی وجہ ہے کہ رنجؔ کی غزلوں میں آتشؔ و ناسخؔ لکھنوی کی وقت پسندی، معاملہ بندی، مضمون آفرینی، رعایت لفظی وقافیہ پیمائی، داغؔ اور امیرؔ کی شوخی و فصاحت، مومنؔ کی نازک خیالی و بلند پروازی اور غالبؔ کی سنجیدگی وجدت پسندی ملتی ہے۔''

[اردو شاعرات کا اولین تذکرہ نگار، حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی، از ڈاکٹر راحت ابرار۔ ص ۶۳]

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی کی کلیات کا تاریخی نام ''مخزن الفصاحت'' ہے جس سے ۱۳۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ رنجؔ کا انتقال ۱۳۰۲ھ بمطابق ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ رنجؔ کی کلیات ان کی وفات کے پانچ سال بعد ان کے صاحبزادے حکیم محمد فخر الدین نے مسٹر جارج پیش شور کی فرمائش پر مطبع ہاشمی میرٹھ سے چھپوائی۔ اس کلیات کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فن شاعری میں وہ اپنے استاد مرزا غالبؔ کے مقابلہ دوسرے معاصرین کے رنگ و آہنگ سے زیادہ متاثر تھے اور خصوصاً داغؔ سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتے ہیں۔

حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی نے اپنی کلیات میں بعض مقامات پر اپنا تخلص طبیبؔ بھی استعمال کیا ہے۔ یہ کوئی حیرت کن بات نہیں کیونکہ اس دور میں دو تخلص استعمال کرنے کا رواج بھی ملتا ہے، جیسے اسد اللہ خاں غالبؔ کی کچھ غزلوں میں اسدؔ اور کچھ میں غالبؔ تخلص موجود ہے:

بگڑی رہے گی یار سے کیا عمر بھر طبیبؔ
کیوں عرش پر ہے چرخ جفا کار کا مزاج

بیمار عشق تھا میں مجھے قتل کرکے وہ
بولے طبیبؔ رنجؔ کا ہم نے کیا علاج

طبیبؔ عقل پر تمہاری پتھر پڑے ہیں
بتوں کو پوجتے ہو بندۂ خدا ہوکر

رنجؔ کی غزلوں میں شوخی، نزاکت، پیکر تراشی، کج ادائی، معاملہ بندی اور ذہنی کیفیتیں فانوس خیال کی پرچھائیوں کی طرح متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ درحقیقت وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے اور انہوں نے جن تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے وہ ان کی پختہ کلامی کو ظاہر کرتے ہیں۔ آیئے اب ان کے کلام پر کچھ شاعروں کے اثرات کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

کلام برنگ غالبؔ:

وائے قسمت وہ بھی انکے عاشقوں میں ہو گیا

جو مری قسمت سے میرا نامہ بر پیدا ہوا

لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کے

لاکھوں لگاؤ ایک میرے اضطراب میں

جائے گا نہ اس جنبشِ ابرو کا خیال

کیا کہیں گوشت بھی ناخن سے جدا ہوتا ہے

کلام برنگ داغؔ:

گو نہ آتا میرے دل کو تو قرار آجائے

مجھ سے اقرار تو کر جاؤ کہ ہم آتے ہیں

ہم عشق میں بدنام ہیں تم حسن میں رسوا

عزت نہ تمہاری ہے، نہ توقیر ہماری

سب یاد ہیں مجھے تیری بے التفاتیاں

وہ دل، وہ آرزو، وہ تمنا کہاں ہے اب

انہوں نے صرف معاصرین شعراء کی تقلید ہی نہیں کی بلکہ ایسے اشعار بھی کہے جو اردو شعروادب میں عصر حاضر کے معیار پر کھرے اترتے ہیں اور اس کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

معلوم نہیں کچھ کہ میں آیا ہوں کہاں سے

جاؤں گا کہاں، آیا تھا کیوں، کون ہوں، کیا ہوں

ہر سانس کے چلنے سے عیاں سر پہ سفر ہے

کس وقت قدم ہم سر منزل نہیں رکھتے

نظر آتی نہیں اپنے میں برائی اپنی

آئینہ دوسرے کا عیب نما ہوتا ہے

اے رنج میکدے کو چلو اور پیو شراب

سب کہتے ہیں کہ عید کا روزہ حرام ہے

ہمیشہ سے ہیں زمانے کے لوگ مردہ پرست

نہ تاحیات ہوا میرا قدرداں کوئی

عشق میں ہم نے کہا، اپنوں کو غیر

تم نے کیوں کر غیر کو اپنا کہا

غش ہوئے تھے جسکو موسیٰ دیکھ کر

میں وہ جلوہ عمر بھر دیکھا کیا

قتل میرا تمہیں منظور ہوا خوب ہوا

رنج تھا رنج چلو دور ہوا خوب ہوا

یہ تو اے رنج خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

آدمی موت سے مجبور ہوا خوب ہوا

جو ہے قسمت میں وہی ہوگا مسیحا لیکن

ہو تو جایا کرو اپنے کبھی بیمار کے پاس
کل دیکھ کر اے رنجؔ وہ نازک سی کلائی

نسخہ نہ کوئی یاد رہا اور نہ دوا یاد
جذب دل کا میرے اب مجھ سے نہ کرنا شکوہ

پھر تصور نے تمہارے مجھے چھیڑا دیکھو
دل سے جاتا رہے گا خوف گناہ

مجھ کو اللہ پارسا نہ کرے

رنجؔ کی قطعہ نگاری:

یہ بھی حقیقت ہے کہ حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی نے غزل ونظم کے ساتھ قطعہ پر بھی طبع آزمائی کی اور بہت جلد انہیں قطعہ گوئی میں بھی قدرت حاصل ہوگئی۔ انہوں نے خصوصی مواقع کے لئے بڑی تعداد میں قطعات کہے ہیں۔ان کے یہاں موضوعاتی،شاعرانہ اور تاریخی تینوں نوعیت کے قطعات ملتے ہیں مگر تاریخ گوئی سے چونکہ انہیں خصوصی دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے تاریخی قطعات کثرت سے کہے،ان کے نکالے ہوئے تاریخی ماڈے بہت ہی صاف ستھرے اور حالات وواقعات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اپنے صاحبزادے حکیم فخر الدین کی ولادت پر رنجؔ نے یہ قطعہ تاریخ کہا:

جب تولد ہوا میرے گھر میں
میرا تفریح روح و لخت جگر

جلوہ آرا ہوئے نشاط و سرور
بن گیا آفتاب نورِ نظر
بے سر امتحان سروش اے رنج
بول اٹھا کہ ان کو لکھ اختر

[۱۲۷۶ھ]

اسی طرح قطعہ تاریخ وفات شیخ کریم الدین مرحوم تخلص اشک دوست و شاگرد۔ ملاحظہ فرمائیں:

اے جگر سوختہ رنج ناشاد
جب میرے شیخ نے کی خدا کی سیر
لب الہام سے آئی آواز
ہو گیا اشک کا انجام بخیر

[۱۲۹۳ھ]

اور پھر یہ بھی 'قطعہ تاریخ مسجد لب آب چناب متصل وزیر آباد پنجاب دیکھئے:

ملّا ظہیر نے لب چیناب واہ واہ
کیا مسجد بلند رکھی ہے یہ بنا
مسجد تو ہے بلند ولے در ہے مختصر
اس واسطے کہ رند بھی آوے تو سر جھکا
فرمایا مجھ سے صاحب موصوف نے کہ رنج

آئی ندائے چرخ کہ ''ہے خانہء خدا''

۱۲۷۶ہجری

رنج میرٹھی کی کلیات میں کل ۲۳ قطعات درج ہیں۔انہوں نے جو قطعات کہے ہیں وہ اردو شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اوران کی ادبی حیثیت آج بھی برقرار ہے۔

رنج بحیثیت قصیدہ نگار :

رنج میرٹھی کی کلیات ''مخزن الفصاحت'' میں چھ قصیدے ملتے ہیں جبکہ ان کے نعتیہ کلام ''گلشن نعت'' میں بھی دو نعتیہ قصیدے موجود ہیں۔ان قصائد میں سے دو کا تعلق نواب ملک علی خان کی ذات سے ہے۔رنج نے غزل کی طرح قصیدہ میں بھی اپنی فنکاری اور صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔نواب ملک ولی خاں سے متعلق قصیدوں کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

دل ہے بے تاب زیارت کو یہ بے تابی ہے
چاہتا ہے کہ کسی پہلو سے نکلے باہر
تیری جرات کو نہیں حاجت ساماں ہرگز
نکلے میداں میں جو یہ دست سراپا جوہر
کیا ہی بے آب تیرے دست سخاوت نے کیا
قدر قطرے کی صدف میں رہے گوہر ہوکر

رنج کے معاصرین نے ان کی شاعری پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے

رنج کو''ارسطو فطرت''،''افلاطون فراست''،''مالک ملک دانشوری''،''استاد بے بدل اقلیم سخنوری''،''حضرت جالینوس مرتبت''،''کلیم کلام''،''عندلیب گلستان سخنوری''، ''بلبل بوستان شاعری''،''فصاحت بیان''،''بلاغت نشان''،''ناظم نازک خیال''، ''دل اہل کمال'' جیسے الفاظ والقاب سے نوازا ہے جس سے ان کی شاعرانہ اور ادبی حیثیت کا تعین بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی نے اولین تذکرۂ شاعرات''بہارستان ناز'' لکھ کر اور انجمن پنجاب کے زیر اثر جدید نظم کی تحریک میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا ساتھ دے کر اردو شعر وادب کی جو آب پاشی کی اسے ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اردو کے اس قلندر شاعر پر اہل میرٹھ کو نہ صرف فخر کرنا چاہئے بلکہ رنج کے کلام سے نعت کی عظمت، غزل کی آبرو، قطعہ کی اہمیت، قصیدہ اور نظم کی رفعت و بلندی کو محسوس کرتے ہوئے شاعری کے روشن چراغ کی لو کو مدہم ہونے سے بچانے کی ذمہ داری بھی انہیں کی ہے۔

باب چہارم

مولانا اسماعیل میرٹھی
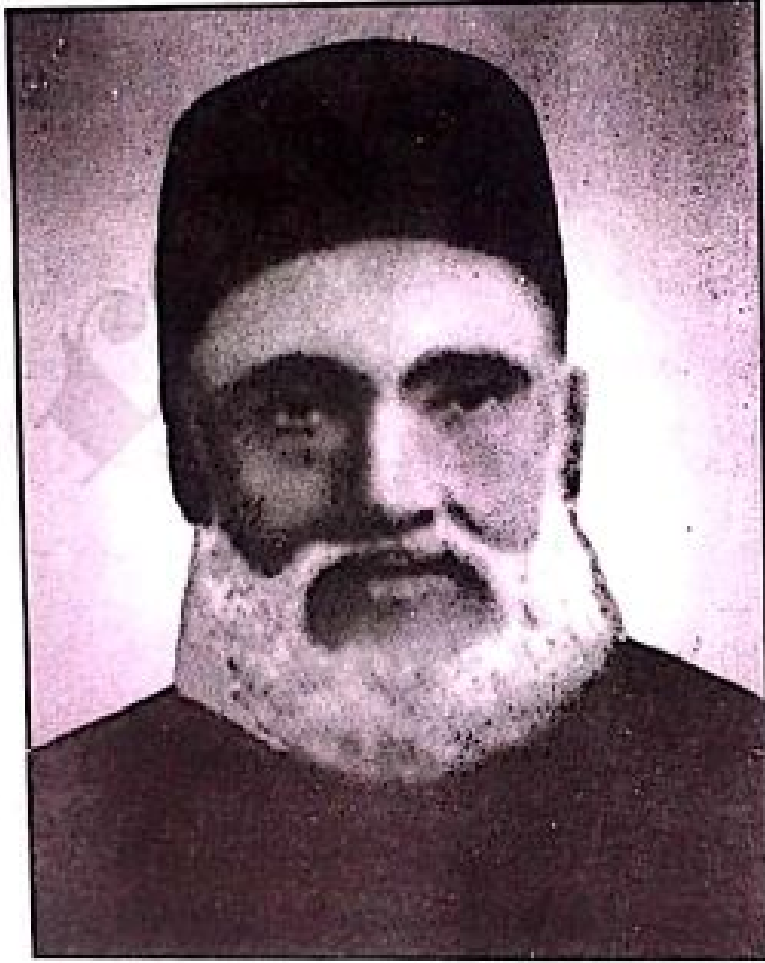
پیدائش: ۱۲؍نومبر ۱۸۴۴ء وفات: یکم نومبر ۱۹۱۷ء

مولانا اسمٰعیل میرٹھی

مولانا اسماعیل میرٹھی کا شمار میرٹھ کے ان لعل و گہر میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید اردو شاعری کو ایک نئی جہت دی۔ وہ جدید اردو شاعری کے بانیوں میں سے بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں محاوروں کو جہاں خوب برتا ہے وہیں زبان کی سلاست اور روانی کو بھی برقرار رکھا۔ ان کا اسلوب بالکل نیا اور نکھرا ہوا ہے۔ مولانا نے فنِ سخن کی تکمیل کے لئے جس ذوق وشوق سے کام کیا اس کی جاذبیت ان کی شاعری میں جابجا موجود ہے۔ انہوں نے بچوں کے ادب کو اپنے زورِ طبع اور پروازِ تخیل سے جو وسعت دی اس کے بھی سبھی قائل ہیں۔

جدید نظم کے ارتقا میں ان کی قدر و قیمت اور مقام مسلّم ہے۔ ہیئت کے مختلف تجربے اور مختلف اصناف میں ان کی گراں خدمات سے ہی شعری افق پر ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے شخص اور شاعر کی زندگی کے رموز و نکات، نشیب و فراز اور ادب میں ان کی خدمات و کارناموں کا آیئے یہاں تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

سوانح حیات

مولانا اسماعیل میرٹھی کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ ان کے جدِّ امجد مولانا حمید الدین خجندی ۱۵۲۵ء میں محمد ظہیر الدین بابر (مغلیہ سلطنت کا شہنشاہِ اول) کے ہمراہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ مولف ''حیات و کلیات اسماعیل'' نے لکھا ہے کہ قصبہ سیکری ضلع مظفر نگر کی چودھرات بطور انعام قاضی حمید الدین کو عطا کی گئی لیکن ان کے صاحبزادے مولانا احمد نے قصبہ لاوڑ ضلع میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جلال الدین محمد اکبر نے دو فرمان جاری کر کے مولانا داؤد کے صاحبزادے مولانا احمد کو لاوڑ اور شمس پور تپہ لاوڑ میں جائداد عطا کی تھی۔ مولانا اسماعیل کے والد شیخ پیر بخش ۱۴ر جولائی ۱۸۳۸ء کو مستقل طور پر میرٹھ میں قیام پزیر ہوئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو اس دنیا میں آنکھ کھولی۔ مولانا اسماعیل میرٹھی تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی ایک بہن بھی تھیں جو اُن سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی کے والد کے خالو حافظ شیخ مینڈھو میرٹھ میں مقیم تھے۔ وہ صاحب جائداد تھے لیکن بے اولاد تھے۔ ان کو اپنے بھانجے سے بہت انسیت تھی۔ ان ہی کے اصرار پر یہ خاندان لاوڑ سے میرٹھ منتقل ہو گیا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے والد کا انتقال ۷۸ سال کی عمر میں ۷ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو میرٹھ میں ہوا۔

تعلیم:

دستور کے مطابق اسماعیل میرٹھی کا پہلا مکتب ان کا گھر تھا۔ انہوں نے اپنے والد سے فارسی کا درس لیا۔ دس برس کی عمر میں قرآن پڑھنا شروع کیا اور پانچ ماہ میں ناظرہ پڑھ لیا۔ فارسی کی اعلیٰ تعلیم مرزا رحیم بیگ کی نگرانی میں ہوئی۔ یہ وہی مرزا رحیم بیگ ہیں جنہوں نے مرزا غالب کی ''قاطع برہان'' کے جواب میں رسالہ ''ساطع برہان'' نکالا تھا۔ مولانا اسماعیل اس وقت متعلم تھے اور مختلف لغات سے استاد کو معانی سنانے کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسودات بھی تحریر کر دیا کرتے تھے۔ محمد اسماعیل نے اپنے بیٹے اسلم سیفی کو بتایا تھا کہ ایک زمانے میں قلق میرٹھی نے مرزا رحیم بیگ کے کلام پر نکتہ چینی کی تھی اور محمد اسماعیل نے نظم میں ہی قلق کے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ قلق سے مولانا کی دوستی تھی مگر انہوں نے استاد کا ساتھ دیا۔ اس واقعہ پر مرزا رحیم بیگ نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں مولانا اسماعیل میرٹھی نے گلستاں اور بوستاں، شاہنامہ اور دیگر ضروری کتب فارسی ختم کر لی تھیں۔ فارسی تعلیم کے بعد معاش کی فکر دامن گیر ہوئی۔ میرٹھ میں نارمل اسکول میں داخل ہو گئے۔ منشی ایسری پرشاد یہاں علم ہندسہ کے استاد تھے مولانا نے ان سے فزیکل سائنس اور علم ہیئت ذاتی دلچسپی کی بنا پر سیکھ لئے گو یہ ان کے نصاب میں شامل نہ تھے اور علم ہندسہ میں بھی تکمیل بہم پہنچائی۔

نارمل اسکول کے بعد مولانا اسماعیل میرٹھی نے اوورسیری کی تعلیم حاصل کر

نے کی غرض سے رُڑکی کالج میں داخلہ لیا لیکن کچھ ذاتی پریشانیوں اور الجھنوں کے سبب انہوں نے یہاں کی تعلیم ترک کردی۔ گھر کی یاد نے بھی اس درمیان انہیں رُڑکی چھوڑ کر میرٹھ واپس لوٹ آنے پر مجبور کردیا۔

ملازمت :

اس زمانے میں معلم کا پیشہ باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ حکومت اور سماج دونوں میں اساتذہ کی حیثیت مسلم تھی اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ محمد اسماعیل نے اسی پروقار پیشے کو اختیار کیا۔ سولہ برس کی عمر میں ۱۰ر جولائی ۱۸۶۰ء کو انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ کے محکمے میں ایک کلرک کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۸۶۷ء تک وہ مستقل طور پر میرٹھ میں ملازم رہے۔ اس کے بعد ان کے کام کی نوعیت بدل گئی اور ڈسٹرکٹ اسکول سہارن پور میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ۱۸۷۰ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ یہاں انہیں عربی پر توجہ مبذول کرنے کا موقع ملا۔ کچھ مدت کے بعد انہیں انسپکٹر مدارس میرٹھ کے دفتر میں واپس بھیجا گیا اور ۱۸۸۸ء تک وہ یہیں کام کرتے رہے۔ پھر جولائی ۱۸۸۸ء میں مولانا کا تقرر بحیثیت استاد سینٹرل نارمل اسکول آگرہ میں ہوگیا اور ۱۸۹۹ء تک وہاں اپنے کام پر معمور رہے۔ یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو پینشن لے کر اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور باقی زندگی اپنے وطن میرٹھ میں بسر کی۔

شادی اور اولاد :

۱۸۶۴ء میں مولانا کا عقد بی بی نعیم النساء بنت شیخ محبوب بخش سے ہوا۔ یہ نیک سیرت خاتون تھیں۔ یہ بھی مولانا حمید الدین خجندی کی اولاد میں سے ہی تھیں۔ ان

کے دادا شیخ محمد اعظم کا شمار اہل اللہ میں ہوتا تھا گو وہ تعلیم یافتہ نہ تھیں مگر سیرت کے اوصاف حمیدہ سے مالا مال تھیں۔ لہٰذا محمد اسماعیل کی ازدواجی زندگی خوش گوار گزری۔ مولانا کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں کے نام محمد محمود احمد، حامد اور محمد اسلم سیفی تھے۔ محمد حامد جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ بیٹی امۃ الاعلیٰ تھی۔ محمد اسلم سیفی اولاد میں سب سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے "مولانا اسماعیل میرٹھی، حیات وکلیات" تالیف کی۔

بیماری اور وفات:

مولانا کی تندرستی ایام جوانی میں اچھی نہ تھی۔ درد قولنج اور درد گردہ کی اکثر شکایت رہتی تھی ان کو کرانک برانکائٹس تھی۔ یہ شکایت سگریٹ کی زیادتی کے باعث تھی۔ ڈاکٹر کی ممانعت پر سگریٹ پینا ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا کے سر میں درد شروع ہوا۔ ۵ رمحرم الحرام ۱۳۳۶ھ کو بخار آ گیا جو بالآخر ان کی جان لے کر ٹلا۔ میرٹھ کی اس عظیم ہستی نے ۱۴ رمحرم الحرام ۱۳۳۶ھ یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر سن عیسوی کے مطابق ۷۳ سال تھی اور ہجری حساب سے ۷۵ سال تھی۔

شخصیت اور کردار:

اسماعیل میرٹھی نہ صرف ایک ممتاز شاعر، ایک عمدہ معلم بلکہ ایک بااخلاق نیک دل انسان بھی تھے۔ ان کی نظموں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس مادی دنیا کو فانی خیال کرتے تھے، لیکن اس نظریے کے باوجود وہ اپنے فرائض سے منہ موڑتے ہیں اور نہ ان کا یہ تصور محبت انسانی کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور نہ ہی یہ ماحول کو بہتر

بنانے کے ارادوں اور کوششوں میں کوئی رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کے معاصرین، شاگرد اور ان کی شاعرانہ ونثری تخلیقات سے فیض اٹھانے والے ہمیشہ ان کی مداحی کا کلمہ پڑھتے رہے ہیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی کو پہلے شاعری سے رغبت نہیں تھی لیکن کچھ معاصرین جن میں قلق کا نام بطور خاص شامل ہے، کی صحبت نے انہیں شعر گوئی کے مطالعہ کے لئے مجبور کر دیا۔ ابتدا میں مولانا نے کچھ غزلیں کہیں لیکن ان کی طبعیت غزل گوئی کی طرف زیادہ مائل نہ ہو سکی اور انہوں نے ان غزلوں کو اپنے بھائی، اپنے دوستوں اور فرضی نام سے رسائل وجرائد میں شائع کرایا۔ دراصل نظم نگاری مین ان کی دلچسپی قلق کے اثرات سے بڑھی اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی نظمیں کہیں۔ علاوہ ازیں کچھ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔ نظم کے مطالعے اور ترجمے نے ان کے فن کو پروان چڑھایا۔ پھر ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ منشی ذکاء اللہ اور مولوی محمد حسین آزاد سے چل پڑا اور اس طرح ان کی نظموں کی دھوم آہستہ آہستہ اردو ادب میں مچ گئی اور ان کے کلام کو روانی، پختگی اور پرواز تخیل نے وہ شہرت دی کہ مولانا آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سیفی پریمی لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے کائنات کے حسن وخیر کی تصویریں بڑی عمدگی اور چابکدستی سے کھینچی ہیں ان کے بارے میں انسانی ابتلا اور کلفتوں کے نقوش میں شفقت اور خلوص کی لہریں موجزن ہیں۔''
>
> [اسماعیل میرٹھی۔ حیات وخدمات، سیفی پریمی، ص:۳۱]

زندگی اور عالم فانی کے ناپائدار ہونے کے یقین کے باوجود اسماعیل میرٹھی نے کہیں بھی زندگی کے حسن جمال سے منہ موڑنے کی تعلیم نہیں دی۔ گو وہ زندگی کے بے ثبات ہونے پر زور ضرور دیتے تھے۔ انہوں نے مسائل تصوف کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے سیفی پریمی کے الفاظ میں ''ان کے یہاں ماورائیت کا ایک واضح احساس وروحانی خلش اور اس کے ساتھ ہلکی سی غم کی تہ بھی ملتی ہے۔''

مولانا کو اس مادی دنیا کی تمام رعنائیوں اور مسرتوں کا احساس وادراک تھا۔ فنون لطیفہ ان کے لئے خوشی کے سرچشمے تھے۔ روشنی، رنگ اور موسیقی کا احساس ان کی شاعری میں واضح ہے۔ ان کے اشعار سے احساس ہوتا ہے کہ چمن میں کھلی نوشگفتہ کلیاں ان کو خوشی ومسرت عطا کرتی تھیں یا نیلے آسمان پر کالی گھٹاؤں کا منظر یا زندگی بخشتی برسات کی پھوہاریں اور اس کے بعد پیاسی دھرتی سے اٹھتی سوندھی بوان کے ذہن کو خوشبوؤں سے بھر دیتی تھی۔

شاعر ہونے کے ناطے ان کا ذہن نزاکت، لطافت، حسن اور ادراک سے مالا مال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک عملی وکاروباری انسان کی عقل وشعور بھی رکھتے تھے۔ وہ محض خواب وخیال کی دنیا کے شاعر ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے مطالعہ میں بے انتہا ریاضت کی تھی۔ فنکار اور اپنے بہترین معاصرین کے شاہکاروں کا انہوں نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ اپنی نظموں کی بار بار اصلاح وترمیم کر کے مصرعوں کو جلا بخشی تھی، یہاں تک کہ بعض مصرعے اور اشعار اس اصلاح وارتقا کے بعد بالکل تبدیل ہو کر نئی شکل وصورت میں منظر عام پر آئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو

ان کی شاعری کی جان اور روح ہیں۔

ادبی خدمات :

مولانا اسماعیل میرٹھی نے ادب کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دیں ہیں اور جو ادبی خدمات ان کی شخصیت کو تاریخ ساز بناتی ہیں وہ نظم جدید کے ارتقاء میں ان کا حصہ اور ادب اطفال میں ان کا کارنامہ ہیں۔

علی گڑھ تحریک :

حالانکہ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی ہندوستان پر مکمل فتح پر ختم ہوئی، لیکن ذلت وشکست کے باعث ذہنی طور پر ہندوستان کو ایک نئی قوت عطا ہوئی اور ایک نئی راہ عمل ان کے سامنے آئی۔ کچھ مدت کی عارضی مایوسی کے بعد تاریک افق پر امید کا سورج طلوع ہوا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سیکولرازم وسوشلزم کے قومی ترانے کا اولیں بول ۱۸۵۷ء کے شہدا نے اپنے خون سے تحریر کئے ہیں۔ سماجی طور پر اس دور میں قومیت، جمہوریت وسوشلزم کے تصورات کا نہ تو اتنا بول بالا تھا اور نہ ہی اس کی زیادہ گنجائش۔ مگر سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے نے ہندوستان کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا اور عوام میں بیداری کی لہر پیدا کی۔ رائے نے براہمو سماج قائم کر کے معاشرے کو ابتری سے بچالیا اور سرسید نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈال کر معاشرے کو نئی جان عطا کی۔

علی گڑھ تحریک کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے مسلمانوں میں تنظیمی وتعلیمی عمل کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ دراصل اس تحریک کا اصل مقصد

مسلمانانِ ہند کی زندگی میں علم کے چراغ کو روشن کرنا تھا اور ان کے ذہن سے مغربی تعلیم کی نفرت کو نکالنا تھا، جو کہ انگریزوں کے مظالم کے باعث ہر مسلمان کے ذہن میں گھر کر چکی تھی اس کے علاوہ ان کے کلچر کی اصلاح کرنا اور کلچر کو ایک نئی زندگی دینا بھی تھا۔ اس دور بیداری نے حقیقت پسندی اور ادب اور زندگی کے قریبی رشتے پر زور دے کر ادب کو صحت مند بنایا۔ سرسید کا عظیم کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے نئی نسل کے احساس وادراک کا رخ عقلیت اور جدیدیت کی طرف موڑا۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید کی سعی جمیل اینگلو اورینٹل کالج کی شکل میں وجود میں آئی۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزی حکومت نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ ایسا تعلیمی نظام جاری کرنے کا فیصلہ کیا جس کے ذریعہ سائنس، آرٹ، فلسفہ اور ادب کی تعلیم انگریزی زبان میں دینا تھی۔ لیکن ملک میں تعلیم انگریزی زبان میں دیئے جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مغربی ادبی تحریکوں سے ہندوستانی ادبا وشعرا باخبر ہو گئے۔ انگریزی ترجمے ہونے لگے اور جس کے باعث مغربی ادب وشاعری کے شاہکاروں وفن پاروں سے اردو ادب کو فیض پہنچا۔

جدید نظم کے ارتقاء میں مولانا اسماعیل میرٹھی کا حصہ

سولہ برس کی عمر میں مولانا اسماعیل میرٹھی انسپکٹر مدارس سرکل میرٹھ میں ملازم ہوئے۔ ان کے ساتھ مولا بخش قلق میرٹھی بھی ملازم تھے اور ان دنوں وہ انگریزی کی اخلاقی نظموں کے ترجمے میں مصروف تھے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی نے قلق کے منظوم تراجم کا مطالعہ کیا۔ یہ تراجم کا مجموعہ 'جواہر منظوم' کے نام سے ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ

پریس الہ آباد سے طبع ہوا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی انگریزی نظموں کے تراجم سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اسی طرز پر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے ہی کئے، اس واقعہ کو ان کے صاحبزادے محمد اسلم سیفی نے ''حیات وکلیات اسماعیل'' میں اس طرح تحریر کیا ہے :

''مسٹر ٹی جے کین مدارس سرکل میرٹھ نے انگریزی زبان کی اخلاقی نظموں کا انتخاب فرمایا۔ ان کا ترجمہ قلق میرٹھی سے کرایا کیونکہ اس دفتر میں آپ بھی ملازم تھے اس ترجمے کا بغور مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا مولانا فرمایا کرتے تھے اس ترجمے کو دیکھ کر استعجاب ہوا کہ شاعر ایسا کلام بھی لکھتے ہیں۔ ایک طرف دور از کار حیرت انگیز مبالغے جو غزل اور قصیدے کی جان سمجھے جاتے تھے ادھر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی صحیح مصوری وہ بھی سادہ اور سلیس طرز میں۔ حقیقت میں اس ترجمے کا مطالعہ ایک امر اتفاقی تھا جس نے مولانا کی طبیعت کا رخ بالکل بدل دیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر بعض انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا یہ نظمیں کلیات میں موجود ہیں۔ آئندہ کے لئے اپنے کلام کی بنیاد اس نئے انداز پر رکھی۔''

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین اپنے مضمون ''میرٹھ میں اردو شاعری کا ارتقاء'' میں کچھ اس طرح گویا ہوئے :

''اس وقت افسر تعلیم جناب کیمسن تھے ان کے حکم سے انسپکٹری

جے کین حلقہ میرٹھ نے کچھ اخلاقی نظموں کو چن کر ایک نصابی

کتاب بنائی تھی اور ان نظموں کا قلق میرٹھی نے ترجمہ کیا تھا۔

مولانا اسماعیل نے اس خوبصورت ترجمے کو دیکھا تو اس کا بڑا اثر

ہوا اور اس کے بعد سے ہی ان کی شاعری نے ایک نیا موڑ لیا۔

[تحقیق وتنقید از: ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین]

منظوم تراجم:

مولانا اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا اولین مجموعہ ۱۸۸۵ء میں ''ریزۂ جواہر''

کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں چھ نظمیں ایسی بھی شامل ہیں جو انگریزی

نظموں کا ترجمہ ہیں اور وہ اس طرح سے ہیں:

(۱) کیڑا (۱۸۶۷ء) (۲) ایک قانع مفلس (۱۸۶۷ء) (۳) موت کی گھڑی

(۱۸۶۷ء) (۴) فادر ولیم (۱۸۶۷ء) (۵) حب وطن (۱۸۶۷ء) (۶) انسان کی

خام خیالی (۱۸۶۸ء)۔

(۱) کیـــــــڑا : پندرہ اشعار پر مشتمل یہ نظم مولانا اسماعیل میرٹھی کی تخیل

پروازی اور فن ترجمہ نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس نظم میں اخلاقی درس بھی دیا گیا

ہے۔ اس نظم میں مور کی خوبصورتی اور کیڑے کی زندگی کے حسن کا موازنہ کر کے انسان

کو ہمدردی کا سبق دیا گیا ہے۔ نظم اس خوبی سے ترجمہ کی گئی ہے کہ ترجمہ کا گماں بھی

نہیں گزرتا بلکہ یہ ایک تخلیقی نظم ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ اشعار پیش نظر رکھتے

ہوئے ان کی نظمیہ نگاری کو ذرا پرکھئے :

کیڑا

تم اس کیڑے کو دیکھو تو لگاتار
تمہاری راہ میں ہے گرم رفتار
کسی سوراخ میں دن کاٹتا ہے
سویرے اٹھ کے شبنم چاٹتا ہے
اسے قدرت نے زریں پر دیے ہیں
کچھ ایک سرخی و سبزی بھی لیے ہیں
تمہیں لگتی ہے اچھی مور کی دم
کہ خوش ہوتے ہو اسکو دیکھ کر تم
مگر کیڑے کو بھی سمجھو نہ ہیٹا
یہ مانا خاک مٹی میں ہے لیٹا
کہ ہے دونوں سے دانا سیکھ سکتا
نمونے دو ہیں کاریگر ہے یکتا
بظاہر کچھ نہیں اس کی حقیقت
مگر جب کرتے ہو اس کی بری گت
تو ہے ننھی سی جاں اس کی تڑپتی
ہے تم جیسا ہی ایک جاندار وہ بھی

(۲) ایک قانع مفلس : سولہ اشعار پر مشتمل اس نظم میں دو کردار ہیں ایک کلّن جو سرمایہ دار ہے، دوسرا خود شاعر جو کہ مفلس ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ قناعت مفلس کی بہترین دولت ہے۔ سرمایہ داروں کو کبھی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوتی وہ قدرت کے مناظر سے لطف اندوز ہونے سے قاصر ہیں۔ یہ نظم بھی نصیحت آموز ہے۔ یہ اشعار دیکھئے :

ایک قانع مفلس

سو ہزار ایکڑ ہے کلّن کی زمین
ملک میری ایک بھی ایکڑ نہیں
ہے محل اس کا نہایت شاندار
اور ہمارا جھونپڑا ہے تنگ و تار

پر جہاں تک میری جاتی ہے نظر ملک سب اپنی ہی آتی ہے نظر

مست ہے کلن بایں ناز و نعم میں ہوں چاق وچست ہردم تازہ دم

ڈاکٹر واں ہیں ہیں بہر علاج یاں نہیں ہے ایک کی بھی احتیاج

لطف قدرت کا نہیں اس کو نصیب یہ بہار بےخزاں بھی ہے عجیب

یہ بیاباں یہ سمندر یہ ہوا گونجتی ہے اس میں قدرت کی نوا

کان سے کلن کی لیکن دور ہے وہ تو دولت کے نشے میں چور ہے

(۳) **موت کی گھڑی** : اس نظم میں انیس اشعار ہیں،لیکن یہ نظم مولانا کی بہترین نظموں میں شمار نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس میں روانی کی جگہ تکلف وآورد ہے۔مصرعوں کی چستی بھی کھٹکتی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

موت کی گھڑی

جبکہ طوفاں ہو زندگی میں بپا گھیر لے ہر طرف سے موج ہوا

تھام دل کو نہ خوف کر نہ ہراس کہ نگہباں ہے تیرا تیرے پاس

اس محبت کا دل میں باندھ خیال جس کو ہرگز نہیں ہے بیم زوال

یعنی فرزند جیسا لخت جگر روئے ہم خانہ جیسے جاں پرور

گر دم واپسی جدا ہو جائیں وقت کے وقت سب ہوا ہو جائیں

کر توقع نہ غمگساری کی یاد کر گور کی وہ تاریکی

دل کو رکھ لو امید پر شیدا ہوتا حسرت نگاہ سے پیدا

(۴)**حبّ وطن**: اس نظم میں ملک اسپین کی ایک طوطی کا قصہ نظم کیا گیا

ہے۔اس طوطی کو ایک شخص اسپین سے خرید کر اپنے ملک لے گیا۔طوطی کا اس ملک میں دل نہ لگا اور وہ ملول رہنے لگی۔اس کا چہچہانا تک ختم ہو گیا۔ایک روز اسپین سے ایک مسافر آیا اور اس نے اسپینی زبان میں سلام کیا۔یہ سنتے ہی طوطی باغ باغ ہو گئی۔اس میں نئی روح پیدا ہو گئی اور چہچہانے لگی اور آخر کار اپنے وطن کی محبت میں جان دیدی۔ یہ نظم اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے لیکن چند اشعار پر ہی غور و فکر کر لیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

حب وطن

ایک اسپین کی جواں طوطی — جو کہ بچپن سے تھی اسیر ہوئی
وہ درخشاں پر خجستہ نوا — ہوئی وارد بملک سرد وملا
اس نے وہ پر شمیم نخلستاں — کہ نکالے تھے پر و بال جہاں
سب فراموش کر دئے ناچار — تھا یہاں اور رنگ لیل و نہار
اس دیار غریب میں آکر — سرد خطہ میں پرورش پاکر
آخرش ایسی صم و بکم بنی — چہچہے وہ نہ وہ شکر شکنی
اسی اثنا میں ایک مرد غریب — آیا اسپین سے ملا کے قریب
اسنے طوطی سے جا کلام کیا — حرف اسپین میں سلام کیا
دیا اسنے اسی زباں میں جواب — اور کنج قفس میں ہو بیتاب
کیا ہی مسرور چہچہا کے ہوئی — آخر آخر پھڑک پھڑک کے موئی

(۵) فادر ولیم : زندگی اور موت پر ایک نوجوان اور ایک بزرگ و برتر

ہستی کے درمیان سوال و جواب کے پیرائے میں چوبیس اشعار پر مشتمل یہ نظم ایک عمدہ نظم کہی جاسکتی ہے۔اس کے بھی کچھ اشعار دیکھئے۔

فادر ولیم

نوجواں آدمی نے کی تقریر
اے پدر ولیم اب تو ہو تم پیر

لیک ویسے ہی تندرست ہو تم
خوب چاق و دلیرو چست ہو تم

تھی جوانی میں یہ نصیحت یاد
کہ ہے عہد شباب صورت یاد

اس لئے طاقت و توانائی
کی نہ ضائع بعہد برنائی

بولا پھر وہ جوان نیک شیم
تم تو ہو پیر اے پدر ولیم

اور ناپائدار لطف شباب
ہوتے ہیں کوئی دم کے مثل حباب

مگر ان کا ص الم نہیں تم کو
حسرت بیش و کم نہیں تم کو

ولیم پیر نے جواب دیا
کیا پسندید با صواب دیا

اس لیے تھا خیال آئندہ
سوچتا تھا مال آئندہ

تا کہ پاؤں غم و الم سے اماں
نہ رہے حسرت گزشتہ زماں

پھر بھی گویا ہوا جوان لطیف
اے پدرتم تو ہوگئے ہو ضعیف

ہے تمہیں ذوق داستان اجل
اور پسندیدہ ہے بیان اجل

وہ مخاطب ہوا بسوئے جواں
کہ ہے البتہ مجھکو اطمینان

میں نے اپنے خدا کو رکھا یاد
نہ کیا اس سے نفس کو آزاد

وہی اب میرا دستگیر ہوا
لطف یزداں عصائے پیر ہوا

(۶)**انسان کی خام خیالی :** اکیس اشعار پر مشتمل اس نظم میں اولاً دوسری مخلوقات کا ذکر کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان کے علاوہ سبھی فطری طور پر زندگی گزارتے ہیں۔ اس نظم میں خوشی کی انتہا کو بھی پیش کیا گیا ہے اور انسان کی خام خیالی تو اس کا مرکزی خیال ہے ہی۔ چند اشعار پیش نظم ہیں۔

انسان کی خام خیالی

اے دیدۂ وران آثار ۔۔۔ دنیا میں ہیں کیسے کیسے جاندار
ایسا تو بتاؤ کوئی حیوان ۔۔۔ جیسا نادان ہے یہ انسان
ہر ایک ہے اپنی راہ چلتا ۔۔۔ جس راہ سے مدعا نکلتا
جس شے سے نہیں فائدہ اٹھاتے ۔۔۔ دھوکا نہیں اس میں گاہ کھاتے
انسان ہے اگرچہ سب پہ فائق ۔۔۔ مشہور ہے اشرف الخلائق
اڑتا ہے مگر اسی کا خاکا ۔۔۔ پتلا ہے یہ سہو اور خطا کا
انسان بخلاف حکم قدرت ۔۔۔ کرتا ہے خیال ترک فطرت
ہو دل کو خوشی نہیں یہ ممکن ۔۔۔ جب تک کہ نہ ہو صفائے باطن
جو لوگ ہیں عقل سے گزرتے ۔۔۔ بیہودہ خوشی پہ ہیں وہ مرتے
گر ہووے خلاف اسکے مضمون ۔۔۔ باطل ہیں دلائل فلاطون

یہ سچائی ہے کہ میرٹھ کے دو مایہ ناز فرزند قلق میرٹھی اور مولانا اسماعیل میرٹھی ہی ایسے لوگ تھے جنہوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں سے کافی قبل اہل ادب کو منظوم تراجم کے ذریعہ انگریزی نظم کی خوبیوں سے روشناس کرایا۔ یہ کم بڑی بات نہیں

ہے، اس پہلو سے بھی ہم ان دونوں شاعروں کو بڑے فن کار کا نام دے سکتے ہیں۔

طبع زاد نظمیں: اس دور کی بعض عظیم ادبی شخصیات کو انگریزی نظم کی خوبیاں محسوس ہوگئی تھیں اور انہوں نے ان خوبیوں کو ایک طرف اردو داں طبقے تک پہنچایا اور دوسری جانب اردو شعراء کو انگریزی انداز کی نظم نگاری کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا۔ انگریزی نظم کی خوبیوں کو سرسید سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا اور اس سے متاثر ہوکر ''اردو نظم نگاری'' کو رواج دینے کی تمناسب سے پہلے ان کے دل میں پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے ہم عصروں مثلاً محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالؔی مولانا اور اسماعیل میرٹھی کو لگاتار اس صنف میں طبع آزمائی کے لئے اکسایا۔

مثنویات: مثنوی اردو کی ایک مقبول صنف سخن ہے جو فارسی سے اردو میں داخل ہوئی بہمنی دور میں مثنویوں کی ابتدا ہوئی اور نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ، پدم راؤ'' کو اردو کی اولین مثنوی تسلیم کیا جاتا ہے شمالی ہندوستان میں بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ'' محمد افضل کی 'بکٹ کہانی' پہلی مثنوی ہے''۔

اردو مثنوی کا ایک اہم موڑ جدید نظم سے وابستہ ہے مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ'' جدید نظم'' کے لئے منظم طور پر جو کوشش کی ہے وہ مثنوی کے فروغ کے لئے ایک نیک فال تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے 'شب قدر'، 'ابر کرم'، 'خواب امن'، 'وداع'، 'انصاف'، 'صبح امید'، 'گنج قناعت'، 'داد انصاف' وغیرہ مثنویاں تحریر کیں۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ان کی ہم نوائی کی اور مشاعرہ پنجاب کے لئے مثنویاں تحریر کیں، مثلاً 'برکھا رت'، 'چپ کی داد' وغیرہ۔ اس مقام پر مثنوی اور

نظم جدید میں حد فاصل قائم کرنا دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ آزاد اور حالؔی کی جدید نظمیں بھی مثنوی کی صنف میں کہی گئیں۔ آزادؔ اور حالؔی کے شانہ بشانہ مولانا اسماعیل میرٹھی بھی نظم جدید کی تحریک کے ایک اہم رکن ہو گئے اور اس سے ان کی شخصیت دوبالا ہو گئی۔ آزاد اور مولانا اسماعیل میرٹھی کے دواوین میں مختصر نظموں کو بھی مثنویات لکھا گیا ہے، اس طرح قدیم مثنوی نگار شعرا اور سرسید تحریک کے شعرا میں مثنوی کے بارے میں یہ فرق نظر آتا ہے کہ قدما کے نزدیک مستقل تصنیف کا نام مثنوی تھا، جیسا کہ ایران میں رواج تھا مگر جدید دور میں مختصر نظم بھی بڑی حد تک مثنوی کے ذیل میں آ گئی ہے۔

مثنوی میں نیچرل شاعری کی سطح پر آزادؔ، حالؔی اور اسماعیلؔ تینوں برابر کی صف میں نظر آتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے نوخیز ذہنوں کو زیادہ متاثر کیا ہے اور ان میں صحیح ذوق پیدا کرنے میں ان کے کلام نے کافی مدد دی۔ اقبالؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہاں آبادی وغیرہ کے یہاں نیچرل شاعری کے عناصر اسی راہ سے داخل ہوئے۔

کلیات اسماعیلؔ مولفہ اسلم سیفی میں مثنویات کی تعداد اکھتر (۷۱) بتائی گئی ہے لیکن اس میں نہایت مختصر نظمیں اور قطعات بھی شامل ہیں۔ سیفی پریمی نے اپنے تحقیقی مقالے ''مولانا اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات'' میں اصل مثنویات کی تعداد تیئس (۲۳) بتائی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی یہ تیئس مثنویاں معنوی اعتبار سے دو عنوانات کے تحت آ سکتی ہیں۔ (۱) نیچر (۲) طریقت و شریعت سے متعلق۔

نیچرل شاعری کی ذیل میں آنے والی مثنویوں کے عنوانات حسب ذیل ہیں.......

(۱) آب زلال (۲) داناؤں کی نصیحت دل سے سنو (۳) ترک تکبر (۴) بارش کا پہلا قطرہ (۵) بادمراد (۶) مناقشہ ہوا اور آفتاب (۷) مکالمۂ سیف وقلم (۸) کوہ ہمالہ (۹) کچھوا اور خرگوش (۱۰) دو مکھیاں (۱۱) عجیب چڑیا (۱۲) کوا (۱۳) دال کی فریاد (۱۴) دال اور چپاتی۔

طریقت وشریعت سے متعلق مثنویوں کے عنوانات یہ ہیں.....

(۱) ضائع الٰہی (۲) خدا کی صفت (۳) حمد باری (۴) مناجات (۵) رحمۃ اللعالمین (۶) مثنوی فی العقائد (۷) شمع ہستی (۸) شمع ہدایت (۹) نذر عقیدت۔

مثنوی آب زلال :اس مثنوی کے بارے میں سیفی پریمی نے لکھا ہے :

"مولانا اسماعیل میرٹھی کا دل غوث علی شاہ کے ساتھ تھا اور ذہن سرسید کا ہمنوا تھا مثنوی آب زلال خصوصی طور پر اس سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتی ہے۔اس مثنوی میں پچپن اشعار شامل ہیں۔"

[اسماعیل میرٹھی۔حیات اور خدمات ص:۱۲۱]

مثنوی آب زلال کا شمار اگر اردو کی چند نادر و نایاب مثنویوں میں کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔نہ تو ان کے معاصرین کے یہاں اور نہ ہی ان کے پس رفتگاں کے یہاں اس قسم کی مثنوی کی مثال ملتی ہے۔اس مثنوی میں ان کا گہرا مشاہدہ، سائنسی نکتہ نظر اور فکر کا یہ حسنِ امتزاج پایا جاتا ہے۔مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

خدا نے دی ہے تمکو عقل و تمیز — زرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز
یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے — گرہ کھل جائے تو فوراً ہوا ہے

مزاج اس کو دیا ہے نرم کیسا — جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا
نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ — ہر ایک سانچے میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ
نہ ہو صدمے سے ہرگز ریزہ ریزہ — نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ
تواضع سے سدا پستی میں بہنا — جفا سہنا مگر ہموار رہنا
لگے گرمی تو اڑ جائے ہوا پر — پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھر
ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے — کبھی اوپر سے بادل بن کے برسے
ہوا پہ چڑھ کے پہونچے سیکڑوں کوس — کبھی اولا کبھی پالا کبھی اوس
کہر ہے، بھاپ ہے، پانی ہے یا برف — کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صرف
اسی کے دم سے دنیا میں تری ہے — اسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے
ہر اک ریشے میں ہے اسکی رسائی — غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی
اسی کو پی کے جیتے ہیں سب انساں — اسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں
عمارت کا بسایا اس نے کھیڑا — تجارت کا کیا ہے پار بیڑا
زراعت اس کی موروثی اسامی — صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی
کہیں ساگر کہیں کھاڑی کہیں جھیل — کہیں گنگا، کہیں جمنا، کہیں نیل
کہیں نالا کہیں ندی کہیں سیل — ہے یہ دنیا کی کمسٹریٹ کا جرنیل
یہی پہلے زمیں پر موجزن تھا — نہ میداں تھا نہ پربت تھا نہ بن تھا
زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر — جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر
مگر دنیا میں یکسانی کہاں ہے — جو اب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے

رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا اسے خشکی نے پستی میں ڈھکیلا
پہاڑ ابھرے ہوئے میدان پیدا ہوئے میداں میں نخلستان پیدا
تری کا گو ابھی پلّہ ہے بھاری لڑائی ہے مگر دونوں میں جاری
مگر اب دن بدن چڑھتی ہے خشکی تری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی
کمی بیشی نظر آتی نہیں کچھ بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

سیفی پریمی لکھتے ہیں:

''مولانا نے فکر و مشاہدہ اور جدید سائنسی نقطۂ نظر کی مدد سے پانی کی لازوال عملی قدرت کو ثبوت میں پیش کر کے اس کو فلسفے کی جدید اصطلاح ''دوجہد للبقا'' سے ملا دیا ہے اور اس طرح انسانی کردار کی روشنی کے لئے ذہنی بالیدگی کا سامان فراہم کیا ہے۔ مثلاً نرم مزاجی، طبعیت کی رسائی، ماحول سے مطابقت، صدمے سے ریزہ ریزہ نہ ہونا، تواضع کے ساتھ عمل کی کارفرمائی، جفا سہنا مگر ہموار رہنا، اس مصرعے میں ایک نفسیاتی اشارہ بھی ہے یعنی متوازن دل ودماغ ہی انسان کو محبوب و مقبول بناتا ہے۔''

[اسماعیل میرٹھی: حیات وخدمات، سیفی پریمی، ص:۱۲۳]

لغت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی قابل داد تحسین ہے اس میں روزمرہ محاورے اور خصوصاً ٹھیٹ الفاظ کثیر تعداد میں استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً ''پھندا''، ''دھندا''، ''کھٹ پٹ''، ''جھٹ پٹ''، ''بھینچو''، ''دباؤ''، ''ٹٹولو''، ''اچھالو''،

''گھسو''، ''پیسو''، ''مسل ڈالو''، ''ڈبکی لگاؤ''، ''کانٹ چھانٹ''۔ وغیرہ یہ الفاظ ہماری روزمرہ کی بول چال کا حصہ ہیں اور بادی النظر میں ثقیل محسوس ہوتے ہیں مگر اسماعیل میرٹھی نے ان الفاظ کا استعمال اس خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے کہ ثقیل و اجنبی محسوس نہیں ہوتے اور مصرعوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے استعمال کی جگہ اس سے زیادہ مناسب الفاظ لانا ممکن ہی نہ تھا۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے صاحبزادے اسلم سیفی کے قول کے مطابق مثنوی ''آب زلال'' مولانا محمد حسین آزاد کی فرمائش پہ لکھی گئی تھی۔

> ''مولانا آزاد نے ذوق سخن کی کیفیت سن کر انجمن لاہور کے مشاعروں کے واسطے نظم کی فرمائش کی۔ مولانا نے اس مشاعرے کے واسطے تین مثنویاں تصنیف فرمائیں تھیں جن کے نام یہ ہیں ''کھیاں''، ''چاند'' اور ''آب زلال''۔''
>
> [حیات وکلیات: اسلم سیفی]

مولانا اسماعیل میرٹھی کی مثنوی ''بارش کا پہلا قطرہ'' بھی ایک عمدہ مثنوی ہے جو چھبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا اصل مقصد مسلم قوم کو جو کہ بدحالی کا شکار تھی، ترقی و بہبود کی راہ دکھانا تھا۔ قومی کردار میں جراءت، حوصلہ مندی اور اتفاق و اتحاد کا رنگ بھرنا تھا۔ بطور مثال چند اشعار نذر ہیں:

بارش کا پہلا قطرہ:

گھنگور گھٹا تلی کھڑی تھی ؎ پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ہر ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ　　ناچیز ہوں میں غریب قطرہ

کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس　　اپنا ہی کروں گا ستیاناس

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم　　مٹی، پتھر، تمام ہیں گرم

اس شعر میں مولانا نے قوم کی حالت رقم کی ہے:

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی　　کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

کس طرح ایک فرد کی جراءت ایک قوم کی جراءت میں تبدیل ہو سکتی ہے ملاحظہ ہو:

ایک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور　　ہمت کے محیط کا شناور

بولا للکار کر کہ آؤ　　میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان　　ڈالو مردہ زمین میں جان

یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ　　دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

اس کے بعد اشعار سے ایک طرف بارش کا سماں بندھ جاتا ہے اور دوسری طرف بارش کے پس منظر میں مولانا اپنے مقصد کی جانب ایک اور قدم بڑھاتے ہیں:

دیکھی جراءت جو اس کٹی کی　　دو چار نے اور پیروی کی

پھر ایک کے بعد ایک لپکا　　قطرہ، قطرہ زمیں پہ ٹپکا

آخر قطروں کا بندھ گیا تار　　بارش لگی ہونے موسلا دھار

پانی پانی ہوا، بیاباں　　سیراب ہوئے چمن، خیاباں

نظم کے آخر میں مولانا اپنا مقصد بیان کرتے ہیں:

جرائت قطرہ کر گئی کام　　باقی ہے جہاں میں آج تک نام

اے صاحبو! قوم کی خبر لو — قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری — چل نکلیں گی کشتیاں تمہاری

مختصر یہ کہ اس مثنوی کے ذریعے اسماعیل میرٹھی قوم کو جراءت وجد وجہد کا سبق دیتے ہیں۔اس مثنوی کی زبان پاکیزہ، سادہ اور دل کو چھونے والی ہے۔ مثنوی کے دوسرے مصرعوں میں زیادہ زور ہے اور یہ خوبی مثنوی کو اعلیٰ اور پر اثر بنا دیتی ہے۔

مثنوی باد مراد : اس مثنوی کی تکنیک دوسری مثنویوں سے بالکل مختلف ہے مولانا نے اولاً چودہ اشعار بطرز مثنوی کہنے کے بعد غزل کے انداز میں شعر کہے ہیں۔یعنی مثنوی کے ہر بیت کی طرح مصرعہ ہم قافیہ نہیں ہے بلکہ 'نوا'، 'صبا'، 'ہوا'، 'قوافی' ہیں اور ہے کی ردیف کی پابندی روا رکھی گئی ہے۔اس کے بعد پھر مثنوی کے لوازم کو برتا گیا ہے اور اتالیس مزید اشعار کہے ہیں ان میں سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

چل اے باد بہاری سمت گلزار — تمنائی ہے تیرا ہر گل و خار
نہال ونخل و سبزہ سب ہیں سنسان — گیاہِ مردہ میں تو ڈال دے جان
جو تو لپکے، تو سبزہ لہلہائے — چمن کا بیل بوٹا سر ہلائے

اب غزل کے ماحول پر نظر ڈالئے:

چمن ہے، ابر ہے، ٹھنڈی ہوا ہے — ہجوم طائران خوش نوا ہے
کبھی جھونکا نکل جاتا ہے سن سے — کبھی آہستہ رو موج صبا ہے
چمن کا پتا پتا ہے نوا سنج — صبا کی آمد آمد جا بجا ہے
گلوں کی ڈالیاں جھک گئی ہیں — زمیں پر سبزہ کیسا لوٹتا ہے

اور اس قسم کا آخری شعر ہے

نہیں ہے مجھ کو دعوہ شاعری کا　　　　تو پھر مقطع سے بھی کیا مدعا ہے

اس مثنوی میں بحر و بر، موسم، پانی کا بھاپ بننا، شبنم کے موتی وغیرہ مختلف اشیاء کائنات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی اجاگر کیا ہے کہ کائناتی قوتیں بھی مساوات کا سبق دیتی ہیں۔

خوشامدی تیری خصلت میں نہیں ہے　　　　تری تیزی برابر ہر کہیں ہے

اجاڑا گر کسی مفلس کا چھپر　　　　اکھاڑا خیمہ و خرگاہِ لشکر

نہ در گزرے غریبوں کے مکاں سے　　　　نہ جھجکے طرہ تاج شہاں سے

مناقشہ ہوا و آفتاب : تیس (۳۰) اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں دو عناصر فطرت کی بحث و قدرت عمل کا اظہار ہے۔ ایک مسافر کا لبادہ اتارنے کے لئے سورج اور ہوا میں بحث ہوئی۔ ہوا نے اپنا عمل شروع کیا۔

پھر تو آندھی بن کے چل نکلی ہوا　　　　ایسی بپھری کر دیا طوفاں بپا

اونچے اونچے پیڑ تھرانے لگے　　　　جھوک سے جھونکوں کی چرانے لگے

لیکن ہوا مسافر کا لبادہ اتروانے میں ناکام رہی ہے۔ بعد ازاں سورج اپنی گرمی کا مظاہرہ کرتا ہے اور مسافر اپنا لبادہ اتار دیتا ہے۔ اس مثنوی سے مولانا نے ایک اخلاقی سبق بھی دیا ہے اور ایک نفسیاتی نقطہ بھی بیان کیا ہے، یعنی جذباتی عمل، ہنگامہ آرائی اور جوش و خروش سے دنیا میں کامیابی نہیں ہوتی بلکہ متانت، سنجیدگی، وقار اور عقل کی رہنمائی سے ہی کامرانی و فتح نصیب ہوتی ہے۔

ہمالہ : یہ مثنوی اردو کی تمام مثنویوں میں اہم اور اچھوتی ہے۔ نیچرل شاعری کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ حب الوطنی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ علامہ اقبال کی مشہور نظم ''ہمالہ'' سے یہ مثنوی اس طرح مختلف ہے کہ مولانا کی مثنوی میں سادگی، سچائی اور بے ساختگی خوب ہے:

ہے ہمالہ پہاڑ سر جیون　　جس کے اوپر تلے کھڑا ہے بن
سامنے ایک سیاہ دل بادل　　دیو کی طرح سے کھڑا ہے اٹل

اب فطرت کی گوناگوں خصوصیات پر نگاہ ڈالئے :

سیکڑوں قسم کے ہیں پھول کھلے　　پیڑ باہم کھڑے ہوئے ہیں ملے
کہیں بن مالٹا، کہیں بیلا　　کہیں اخروٹ اور کہیں کیلا
سال کا کیا ہی خوب جنگل ہے　　سورماؤں کا بن کے دنگل ہے
سرو شمشاد ہیں، قطار، قطار　　ریچھ پھرتے ہیں بن کے چوکیدار
ہیں چٹانوں پہ کودتے لنگور　　ایک ہی جست میں وہ پہونچے دور
شیر خونخوار شاہ ہے یاں کا　　پاڑھے چیتے کو خوف ہے جاں کا
بارہ سنگھے غریب پر ہے لتاڑ　　سینگھ ہے اس کے جھاڑ اور جھنکاڑ

یہ مثنوی فطری حسن کے اظہار کا ایک خوبصورت نمونہ بھی ہے۔

نظمیں : مولانا کی بیشتر نظموں سے مثنویات کے تحت بحث کی جا چکی ہے مولانا کی اخلاقی نظمیں بھی بہت سی ہیں۔ ان کی اخلاقی نظموں پر مشتمل مثنوی مجموعہ ۱۸۸۰ میں ''ریزہ جواہر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کی اکثر نظموں کا

ڈنکا بجا اور اہل اردو میں اس مجموعے کی کافی پزیرائی ہوئی۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کے حوالے سے سیفی پریمی کہتے ہیں کہ یہ نظمیں ''اخلاقی نقطۂ نظر کے باوجود کسی زاہد خشک کا فرمان نہیں ہیں۔'' ''اخلاق'، 'حیا'، 'چھوٹے سے کام کا بڑا نتیجہ'، 'قرض' جیسی نظمیں اسی صنف میں آتی ہیں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی اکثر نظموں کا مقصد اصلاحِ قوم ہے اس غرض سے انہوں نے کہیں بے جان اشیاء کا سہارا لیا اور ان کے کردار و عمل کی آڑ میں قوم کو جراءت، محنت، بہتر اخلاق اور قوتِ عمل کی تلقین کی اور کبھی یہی سبق انہوں نے جانوروں کے اوصاف و عادات اور خرابیوں و برائیوں کے ذریعہ دیا۔ ان کی نظموں میں خیر و شر کی طاقتیں زور آزمائی کرتی دکھائی دیتی ہیں اور آخر کار حق و سچائی کی فتح کے ذریعہ وہ قوم کو صراط مستقیم کا پتہ دیتے ہیں۔ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں ہمارے ارد گرد عمل پذیر زندگی کے ذریعہ مولانا قوم کو جراءت، حرکت اور عمل کی تعلیم دیتے ہیں۔

نیچرل نظمیں: مولانا کی نظموں میں نیچر سے متعلق نظموں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ انگریزی ادب سے متاثر ہو کر سرسید نے نظموں میں نیچر اور اس کے متعلقات کو نظم کرنے پر بے حد زور دیا۔ اس لئے ان کے رفقاء نے فطرت کے عمدہ مناظر اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں۔ مولانا کی نیچر سے متعلق جتنی نظمیں ہیں ان میں مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔ علامات، تشبیہات واستعارات اور الفاظ بھی پوری طرح مقامی ہیں۔ ''ہمالہ'' اس کی بہتر مثال ہے۔

اپنی ایک نظم ''ایک گنوار اور قوس وقزح'' میں مولانا نے فطرت کے حسن

سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کی ہے اور نیچر سے متعلق اساطیر کی وجہ سے جو توہمات عوام میں پھیل گئے ہیں اس کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں ایک کسان قوس وقزح میں مشہور "پیالہ زر" کی جویائی میں قوس کی سمت بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن قوس وقزح اس سے ہمیشہ دور رہتی ہے۔

سوچا لو جام اور بنو جم   چھوڑو بزو گوسفند کا غم

یہ سوچ کر وہ قوس وقزح کی طرف بڑھتا ہے۔

بیہودہ گنوار اس گماں پر   سیدھا گیا تیر سا کماں پر

دن گھٹنے لگا، قدم بڑھایا   امید کہ اب خزانہ پایا

جتنی کوشش زیادہ تر کی   اتنی ہی کماں پرے کو سرکی

پنہاں ہوئی قوس آخر کار   اور ظلمت شب ہوئی نمودار

ناکام پھرا وہ سادہ دہقاں   حسرت زدہ، غمزدہ، پریشاں

یوں تو "شفق" سے متعلق مختلف شعراء نے تاثرات بیان کیے ہیں مگر مولانا کی نظم "شفق" میں سائنسی نقطہ نظر کی پرچھائیاں محسوس کی جا سکتی ہیں:

شفق پھولنے کی بھی دیکھو بہار   ہوا میں کھلا ہے عجب لالہ زار

طبیعت ہے بادل کی رنگت پہ لوٹ   سنہری لگائی ہے قدرت نے گوٹ

یہ کیا بھید ہے، کیا کرامات ہے   ہر ایک رنگ میں اک نئی بات ہے

یہ مغرب میں جو بادلوں کی ہے باڑ   بنے سونے چاندی کے گویا پہاڑ

فلک نیلگوں اس میں سرخی کی لاگ   ہرے بن میں گویا لگا دی ہے آگ

اب آثار ظاہر ہوئے رات کے
کہ پردہ چھٹے لال بانات کے

مذکورہ نظم میں سائنسی شعور کی جھلک بھی موجود ہے اور مقامی رنگ والفاظ بھی ہیں مثلاً لوٹ، گوٹ، باڑ، بھید، لاگ، بن، وغیرہ یہ رنگ مولانا کی نظموں کا خاصہ ہے، لیکن یہ الفاظ نظم میں ابتذال پیدا نہیں کرتے بلکہ اس کو حسن بخشتے ہیں۔ برسات میں رنگ دیکھئے۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا   کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا
جہاں کل تھا میداں چٹیل پڑا   وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور   نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

مولانا کی فطری نظموں میں صرف نیچر کی رنگینی کا سماں ہی نہیں ملتا بلکہ ان میں زندگی جیتی جاگتی، رقص کرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً ''رات'' پیش پا افتادہ موضوع ہے اس میں انہوں نے انسان کے مختلف طبقوں کی راحت وکاروبار کا ذکر کیا ہے لیکن کیونکہ وہ قوم کو تہذیب واخلاق کا سبق بھی دیتے ہیں اس لئے ایک شعر بھی سرمایہ دار طبقے کے عیش شبانہ کی بابت نہیں کہا ہے۔

دیہی نظمیں :

مولانا کی شاعری میں دیہی رجحان پایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور اس کو اپنے احساس کا مرکز بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں دیہی زندگی کے حسین مناظر بھی ملتے ہیں اور تلخ تجربات بھی۔ ان مناظر کی منظر کشی

میں انہوں نے الفاظ بھی مقامی ہی استعمال کیے ہیں۔ ان کی نظموں میں کھیتوں، چھوٹی چھوٹی آبادیوں، ان کی سادگی، رونق، راحت کا ذکر شام کو چراغوں کی روشنی صبح کو پرندوں کی آوازیں جھونپڑے، کچے مکان، چراگاہوں میں چرتے مویشی اور مختلف جانوروں و جانداروں وغیرہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ مولانا کا یہی رنگ ان کو اپنے معاصرین میں جدا اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

مئی کا آن پہونچا ہے مہینہ | بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ
زمیں ہے یا کوئی جلتا توا ہے | کوئی شعلہ ہے یا پچھوا ہوا ہے
نہ کچھ پوچھو غریبوں کے مکاں کی | زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
نہ پنکھا ہے نہ ٹٹی ہے نہ کمرہ | ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ
امیروں کو مبارک ہو حویلی | غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

[گرمی کا موسم]

کسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر | کہ گھر میں کرے چین سے شب بسر

[رات]

لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں | پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہے ڈالیاں
چڑیوں کو یہ اڑاں کی طاقت کہاں رہے | پھر کائیں کائیں ہو نہ غٹرغوں نہ چیں چیں

[ہوا چلی]

کون دیتا ہے مجھے یاں پھیلنے | کھا لیا گھوڑے گدھے یا بیل نے

[ایک پودا اور گھاس]

بھنبیری اڑ کہ ساون آگیا اب
گھٹا اُمڈی ہے ساون آگیا اب

زباں اپنی بھگولے او ٹیڑی
بجادے تو بھی او جھینگر نفیری

[ساون کی جھڑی]

ہوئی برباد کھیتی تھک گئے بیل
گئی گزری کسانوں کی کمائی

بہت مزدور ہیں بیٹھے نکمے
نہیں اب کوئی حیلہ جوگدائی

[خشک سالی]

بچوں کی نظمیں : مولانا اسماعیل میرٹھی نے مختلف نظمیں صرف بچوں کے لئے کہی ہیں یہ نظمیں نصابی کتابوں میں موجود ہیں اوران کی بہت سی نظمیں اوران کے متعدد اشعار زبان زدخاص وعام ہو چکے حالانکہ یہ تصوران کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے کہ وہ محض بچوں کے شاعر ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بچوں سے متعلق نظمیں ان کی شاعری کا محض اک چھوٹا سا جز ہیں اوران نظموں کو ہم فطری، مشاہداتی، صفاتی اور تمثیلاتی خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔فطری نظموں میں ''ہوا چلی'' اور'' ساون کی جھڑی'' قابل ذکر ہیں۔

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی

پڑ جائے اس جہاں میں ہوا کی اگر کمی
چوپایا کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی

چڑیوں کو یہ اڑان کی طاقت کہاں رہے
پھر کائیں کائیں ہو نہ غٹرغوں نہ چہچہے

مفہوم کے لحاظ سے یہ نظم بچوں کے لئے افادی حیثیت رکھتی ہے۔آخری دونوں اشعار سائنسی حقیقت سے بچوں کو روشناس کراتے ہیں۔

ساون کی جھڑی میں تشبیہوں اور استعاروں کا حسن داد طلب ہے اور تشبیہات اور استعارات میں مقامی رنگ نمایاں ہے۔ مولانا حسین الفاظ کے پیکر تراشتے ہیں۔

گھٹا کا تن گیا ہے شامیانہ
بجایا رعد نے نقار خانہ

گھٹا کس سوچ میں چپکی کھڑی ہے
برس آخر تو ساون کی جھڑی ہے

کہو کوئل سے امرودوں میں بولے
پھدک ٹہنی پہ تو بھی او ممولے

کٹورا سا ہوا تالاب لبریز
کہو مینڈک سے اپنی لے کرے تیز

زبان اپنی بھگولے اے ٹیٹری
بجا دے تو بھی او جھینگر نفیری

'شفق' اور 'ہوا چلی' کو بھی ہم اسی زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔

مشاھداتی نظمیں : ہر بڑا شاعر یا ادیب اپنے ماحول سے مانوس ہوتا ہے اور روز مرہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات اور گردونواح میں بکھری پڑی چیزوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔ مولانا نے بھی اپنے گردوپیش کی رنگ برنگی دنیا سے بچوں کی دلچسپی یا ان کے لئے نصیحت آموز باتیں تلاش کیں اور ان کو خوبصورت نظموں میں ڈھال دیا۔ متعدد گھروں میں کتے بلی پالے جاتے ہیں اور عموماً یہی جانور بچوں کے لئے خاص دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں بلکہ زیادہ تر بچے ان جانوروں کو کھیل اور کھلونے کا درجہ دیتے ہیں۔ مولانا نے بچوں کی اس نفسیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے 'اسلم کی بلی' اور 'ہمارا کتا ٹیپو' جیسی دلچسپ نظمیں کہیں۔ یوں اسلم گو کہ ان کا بیٹا تھا لیکن مولانا نے اسلم کو ہر گھر کے چھوٹے بچے کی علامت بنا دیا ہے۔

چھوٹی سی بلی کو میں کرتا ہوں پیار　　صاف ستھری ہے بڑی ہے کھلاڑ

گود میں لیتا ہوں تو کیا گرم ہے　　گالے کی مانند رواں نرم ہے

بچوں کو بالواسطہ نصیحت بھی کرتے ہیں یہ بھی بچے کی نفسیات ہے کہ براہ راست کہی بات بچے اکثر ضد کے باعث ماننے سے انکار کر دیتے ہیں لیکن بالواسطہ کہیں تو وہ بات مان لیتے ہیں۔

کھینچ کر دم اب نہ ستاؤں گا میں　　گھر میں سے باہر نہ بھگاؤں گا میں

اب نہ ڈرے گی وہ میری مار سے　　کھیلیں گے ہم دونوں بہت پیار سے

دوں گا جب میں گیند اسے آن کر　　جھپٹے گی وہ اسکو چوہا جان کر

ہم نے بڑے پیار سے پالا اسے　　کہتے ہیں سب چوہوں کی خالہ اسے

یہ نظم پڑھتے پڑھتے ہم اپنے گھر کی جانی پہچانی فضا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم اپنے شریر بچے کے ساتھ نہ صرف اس کی بلی سے کھیلتے ہیں بلکہ بڑی نفسیاتی ترکیب کے ساتھ بچے کو بلی سے اچھے برتاؤ کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ مولانا نے گھر سے باہر کی فضا میں اپنے مشاہدے سے 'پن چکی' کو بچوں کو سبق دینے کے لئے چنا۔ 'پن چکی' میں تنہا نشینی کے بجائے بھیڑ میں رہنے کا مادہ تھا۔ منظر عام پر حرکت و عمل کا نمونہ تھا۔ مخلوق کی خدمت کے ساتھ بچوں اور بڑوں میں فرض کی دھن اور زندگی کو فعال بنانے کا درس تھا۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی　　دھن کی پوری ہے کام کی پکی پکی

پیسنے میں نہیں لگی کچھ دیر　　تو نے جھٹ پٹ لگا دیا اک ڈھیر

کیا تجھے چین ہی نہیں آتا　　کام جب تک نبٹ نہیں جاتا جاتا

مینہ برستا ہو یا چلے آندھی   تو نے چلنے کی شرط ہے باندھی

مولانا اسماعیل نے پن چکی کی آواز کو بھی چکی کا گانا قرار دیا ہے یعنی پن چکی کو کام کرنے سے لطف کا احساس ہوتا ہے اور اس لئے وہ گانا گا رہی ہے۔ دراصل نفسیاتی طور پر وہ وقت پر کام پورا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

تو بڑے کام کی ہے اے چکی   مجھ کو بھاتی ہے تیری لے چکی

بچوں کے ذہن کو پوری طرح پن چکی کی طرف مبذول کرانے کے بعد مولانا اب براہ راست سبق کچھ اس طرح دیتے ہیں۔

علم سیکھو سبق پڑھو بچو   اور آگے چلو بڑھو بچو
کھیلنے کودنے کا مت. لو نام   کام جب تک کہ ہو نہ جائے تمام
جب نبٹ جائے کام تب ہے مزا   کھیلنے کھانے اور سونے کا
دل سے محنت کرو خوشی کے ساتھ   نہ کہ اکتا کے خامشی کے ساتھ
دیکھ لو چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکی

اس طرح مذکورہ نظم مشاہداتی نظم کی ایک خوبصورت مثال قائم کرتی ہے۔

- **تمثیلی نظمیں :** مولانا نے بچوں کو درس دینے کے لئے کئی تمثیلی نظمیں تحریر کیں۔ ان نظموں کے ذریعہ درس دینے کے لئے انہوں نے مختلف جانوروں کو منتخب کیا۔ اس طرح کی نظموں میں 'کچھوا اور خرگوش'، 'دو مکھیاں'، 'اونٹ'، 'ہماری گائے'، 'مور اور کلنگ'، 'بچہ اور ماں'، 'ماں اور بچہ'، 'عجیب چڑیا'، 'کوا'، 'ایک پودا اور گھاس'، 'ایک جگنو اور بچوں کی باتیں'، 'ایک کتا اور اس کی پرچھائیں'، 'ریل گاڑی'، 'ملمع کی انگوٹھی'،

’ایک گدھا شیر بنا تھا‘، ’’ناقدردانی‘‘، ’’ایک لڑکا اور بیر‘ شامل ہیں۔ ان نظموں کے ذریعہ مولانا نے مختلف کہانیاں سنا کر بچوں کو نصیحتیں کی ہیں۔

صبر و محنت میں ہے سر فرازی　　　　ست کچھوے نے جیت لی بازی

نہیں قصہ یہ دل لگی کے لئے　　　　بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے

[کچھوا اور خرگوش]

’’دو مکھیاں‘‘ میں بچوں کو لالچ سے دوری اور ہر کام سوچ سمجھ کر کرنے کے لئے درس دیا گیا ہے کیونکہ حریص مکھی شیرے پر بیٹھ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے جب کہ سمجھدار مکھی مصری کی ڈلی سے غذا حاصل کرتی ہے۔

ایک مکھی کہ ہے نری احمق　　　　فکر انجام اسے نہیں مطلق

کوتہ اندیش لالچی ناداں　　　　دیتی پھرتی ہے مفت اپنی جاں

[دو مکھیاں]

’’اونٹ‘‘ کے ذریعہ خوش خصالی اور حکمت کی خوبیوں کو خوب سراہا گیا ہے۔

اونٹ تو ہے بس حلیم و خوش خصال　　　　تربیت میں چھوٹے بچوں کی مثال

اونٹ گھبراتا نہیں تو بار سے　　　　دیکھتا ہے اس کی جانب پیار سے

’’مور اور کلنگ‘‘ میں مور اپنی خوبصورتی پر ناز کرتا ہے اور اپنے آپ کو کلنگ سے بہتر بتاتا ہے اور کلنگ اونچا اڑ کر یہ ثابت کرتا ہے۔

بھاتا ہے جنہیں نرا دکھاوا　　　　وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا

بس ان کو ٹیپ ٹاپ کی دھن　　　　شیخی کے سوا نہیں کوئی گن

”ایک لڑکا اور بیر“ میں چوری نہ کرنے پر شاعر داد دیتا ہے۔

واہ واہ شاباش لڑکے واہ وا — تو جواں مردوں سے بازی لے گیا

”ایک پودا اور گھاس“ میں پودے اور گھاس کا موازنہ کر کے بچوں کو سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجھ میں اور تجھ میں نہیں کچھ بھی تمیز — صرف سایہ اور میوہ ہے عزیز

فائدہ ایک روز مجھ سے پائیں گے — سایہ میں بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے

ہے یہاں عزت کا سہرہ اس کے سر — جس سے پہونچے نفع سب کو بیش تر

”ایک کتا اور اس کی پرچھائیں“ میں ہوس سے نقصان کا سبق ملتا ہے۔

اپنی پرچھائیں پر کیا جو غور — اس کو سمجھا کہ یہ ہے کتا اور

حرص نے ایسا بیقرار کیا — جھٹ سے غرا کے اسپہ وار کیا

جونہی ٹکڑے پہ اس کے منہ مارا — اپنا ٹکڑا بھی کھو دیا سارا

تم ہوس میں سڑی نہ بن جاؤ — جو ملے اس کو کام میں لاؤ

”ملمع کی انگوٹھی“ اور ”ایک گدھا شیر بنا تھا“ میں نقل اور ذات کی بناوٹ کا بیان ہے اور راستی کی تلقین ہے۔ گدھا شیر کی کھال میں کھیت میں جا گھسا اور کسان ڈر گئے۔ مگر جب وہ بولا تو ملمع اتر گیا۔

جب کھل گیا فریب تو مارے طیش کے — لے لے کے اپنی لاٹھیاں سب پل پڑے گنوار

بچیو سدا تکلف و ناراستی سے تم — کرتا ہے آدمی کو یہ شیوہ ذلیل و خوار

اس سبق کو ملمع کی انگوٹھی میں سونے کا خول چڑھی انگوٹھی اور چاندی کی انگوٹھی کے مکالمے

سے ادا کیا گیا ہے۔

سونے کے ملمع پہ نہ اترا میری پیاری دو دن میں بھڑک اس کی اتر جائیگی ساری
مت بھول کبھی اصل کو اپنی اری احمق جب تاؤ دیا جائیگا ہو جائیگا منہ فق

صفاتی نظمیں : مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے اس قسم کی بھی متعدد نظمیں کہی ہیں جن میں براہ راست اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں ''موعظت''، ''بخیلی''، ''ایک وقت میں ایک کام''، ''سچ کہو'' وغیرہ شامل ہیں۔

ہے کام کے وقت کام اچھا اور کھیل کے وقت کھیل اچھا
جب کام کا وقت ہو کرو کام بھولے سے بھی کھیل کا نہ لو نام
خوش رہنے کا ہے یہی طریقہ ہر بات کا سیکھیے سلیقہ
ایک وقت میں ایک ہی کام پا سکتا ہے بہتری سے انجام
جب کام میں کام اور چھیڑا دونوں ہی میں پڑ گیا بکھیڑا

[ایک وقت میں ایک ہی کام کرو]

سچ کہو، سچ کہو، ہمیشہ سچ ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ
سچ کہو گے تو تم رہو گے عزیز سچ تو یہ ہے کہ سچ ہے اچھی چیز
سچ سے رہتی ہے تقویت دل کو سہل کرتا ہے سخت مشکل کو
سچ ہے دنیا میں نیکیوں کی جڑ سچ نہ ہو تو جہان جائے اجڑ

[سچ کہو]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے اردو ادب میں بچوں کے لئے صفاتی نظمیں تحریر کر کے نہ صرف اردو ادب کو مالا مال کیا بلکہ اردو ادب کی ایک کمی دور کی اور نظمیہ شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان سے قبل با قاعدہ بچوں کے لئے نظمیں کہنا تقریباً نا پید تھیں۔ اس طرح انہوں نے دوسرے شعراء کے لئے ایک نئی صنف کی راہ کھولی، جس پر ان کے پس رفتگاں نے مزید اضافے کئے۔ اس سلسلے میں میرٹھ کے ایک اور فرزند حامد اللہ خاں افسر میرٹھی نے بچوں کے ادب میں مزید کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس نئی صنف کی بنیاد پر ہی مولانا اسماعیل میرٹھی کو ایک تاریخ ساز شخصیت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

مختلف ہئیتوں کا استعمال

مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے نظمِ جدید کی وکالت کی اور اس میں انہیں کامیابی نصیب بھی ہوئی لیکن ان حضرات نے جدید نظم کے لئے صرف مثنوی اور مسدس کی ہیئتوں کا استعمال کیا جبکہ مولانا اسماعیل میرٹھی نے مثنوی اور مسدس کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس، اور مثمن سے بھی کام لیا۔

جھٹ پٹا سا ہو گیا ہے شام کا   اب کہاں باقی ہے موقع کام کا

صاحبو یہ وقت ہے آرام کا

مثلث [اب آرام کرو]

ندی نالے پہاڑ اور میدان   پھول پتے درخت اور حیوان

تیری کاریگری کے ہیں یہ نشاں   ہم نے مانا کہ بے نشاں ہے تو

مربع [بچپن میں خدا کی یاد]

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے   نسیم اور صبا کو بھی بہکا دیا ہے
چمن سرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے   مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے
اٹھو سونے والوں کہ میں آرہی ہوں

مخمس [صبح کی آمد]

آثار سلف (مشعر کیفیت قلعہ اکبرآباد) ۰ے بندوں پر مشتمل مولانا کی یہ نظم مثمن کی ہیئت میں ہے۔ یہ نظم متنوع موضوعات کے لحاظ سے ان کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ یہ نظم قلعہ اکبرآباد سے متعلق ہے۔ قلعہ کی موتی مسجد کے لئے شاعر کہتا ہے۔

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا ورامرا کا   مجمع تھا کبھی یاں حکما و علما کا
چرچہ تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا   ہوتا تھا ادا خطبہ بلند حمد و ثنا کا
ایک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا   جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی میرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایہ مسکین

ان اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے اقبال کی 'مسجد قرطبہ' کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی مثمن کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جس میں اسلاف کے اوصاف پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔

وہ عیش کے مملوک تھے اور بندۂ راحت   گلگشت چمن زار تھی گویا انہیں عزت

برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت   اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت
دنیا کے کسی کام میں ہٹتی نہ تھی ہمت   ۔بے غیرتی زنہار نہ تھی ان کی جبلّت

ہمت میں تھے شاہین تو جرائت میں تھے شہباز
عزت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

[آثار سلف مشعر کیفیت قلعہ اکبرآباد]

اردو شاعری میں غالباً پہلی مرتبہ کسی شاعر نے مسلم مجاہدین کے لئے آثار سلف ''شاہین و شہباز'' کی علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ علامتیں مولانا کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔سیفی پریمی کا خیال ہے:

''ممکن ہے علامہ اقبال نے شعوری یا غیر شعوری طور پر خودی کی علامت ''شاہین'' کا تصور مولانا اسماعیل میرٹھی سے ہی مستعار لیا ہو۔''

ھئیت کے نئے تجربے

مولانا محمد حسین آزاد، حالی، اور ان کے رفقاء نے یقیناً نظم جدید کی مقبولیت کے لئے شعوری کوشش کی اور اس کو مقبول بھی بنایا لیکن انہوں نے یا ان کے رفقاء نے ہیئت کا کوئی نیا تجربہ اردو شاعری میں نہیں کیا۔ نئے تجربات کا آغاز کافی دنوں بعد حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند شاعروں نے آزاد نظم اور نظم معرّیٰ لکھ کر کیا۔ مگر بقول ممتاز ناقد، ماہر لسانیات اور نظریہ ساز پروفیسر گوپی چند نارنگ :

''ان سے بہت پہلے عبدالحلیم شرؔ، نظم طباطبائی اور نادر کاکوروی

اور ان سے بھی پہلے اسماعیل میرٹھی ان راہوں سے کانٹے نکال چکے تھے۔"

[پیش لفظ، اسماعیل میرٹھی: حیات اور خدمات از ڈاکٹر سیفی پریمی ص: ۷]

مولانا اسماعیل میرٹھی جدید نظم نگاروں کی محفل میں نہ صرف امتیازی حیثیت کے مالک ہیں بلکہ ان کو نظمیہ شاعری میں ایک ٹرینڈ سیٹر (Trend Setter) کہنا غلط نہ ہوگا۔ مولانا کی کلیات میں دو نظمیں "نظم بے قافیہ" کے عنوان کے تحت تحریر کی گئی ہیں، اور ان کے عنوانات 'تاروں بھری رات' اور 'چڑیا کے بچے' ہیں۔

تاروں بھری رات

اے چھوٹے چھوٹے تارو   کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے   مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر   جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے   کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

جونہی آفتاب تاباں   نے چھپایا اپنا چہرا
وہیں جلوہ گر ہوئے تم   یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں   بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی   نہ میسّر آتی ان کو
تو غریب جنگلوں میں   یونہی بھولتے بھٹکتے

نہ تمیز راس و چپ کی نہ طرف کی ہوتی انکل
نہ نشان راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن نہیں آنکھ ان کی جھپکی
یونہی شام سے سحر تک ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت وساعت
مگر اے چمکنے والوں ہو تمہیں انہیں بجھاتے
کہ گئی ہے رات کتنی

وہ جہاز جنکے آگے ہے وسیع بحر اعظم
انہیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آرہا ہے واپس
انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے ان کی منزل
نہ تو مرحلے نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تاروں
تمہیں ان کے رہنما ہو

اولاً 'غیر مقفیٰ نظم' اور بعد میں 'نظم معرّیٰ' کے نام سے موسوم کی جانے والی نظموں کا غالباً اردو میں یہ پہلا نمونہ ہے۔ مولانا نے اس نظم میں بحر کا بھی ایک نیا تجربہ

کیا ہے۔ڈاکٹر سیفی پریمی اس کے تعلق سے کہتے ہیں:

''اس نظم کی ہیئت میں صرف یہ بات ہی نہیں کہ یہ ایک بے قافیہ نظم ہے بلکہ مولانا نے ایک مروجہ بحر کے وزن کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے نظم کے لئے یہ ہیئت استعمال کی ہے انہوں نے بحر ''رمل مثمن مشکول'' کے وزن کو ٹکڑے کر کے دو مصرعے بنائے ہیں تیسری جدت یہ ہے کہ ہر بند کے بعد ایک مصرعہ لگایا ہے جو مذکورہ وزن کا ہی ایک ٹکڑا ہے''۔

[اسماعیل میرٹھی: حیات اور خدمات از ڈاکٹر سیفی پریمی ص:۱۹۹]

مولانا کی دوسری بے قافیہ نظم ''چڑیا کے بچے'' ایک چونکا دینے والی نظم ہے۔ذرا نظم تو دیکھیے۔

چڑیا کے بچے

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں ‏ ‏ ‏ چپ چاپ لگ رہیں ہے سینے سے اپنی ماں کے

چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو ‏ ‏ ‏ اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے

اس طرح روز مرہ کرتی ہے ماں حفاظت ‏ ‏ ‏ سردی سے اور ہوا سے رکھتی ہے گرم ان کو

لیکن چڑا گیا ہے چگا تلاش کرنے ‏ ‏ ‏ دانا کہیں کہیں سے پوٹے میں اپنے بھر کے

جب لائیگا تو بچے منہ کھول دیں گے جھٹ سے ‏ ‏ ‏ ان کو بھرائیں گے وہ، ماں اور باپ دونوں

بچوں کی پرورش میں مصروف ہیں برابر ‏ ‏ ‏ اور چھوٹے بچے خوش ہیں، تکلیف کچھ نہیں ہے

اے چھوٹے چھوٹے بچوں تم اپنے گھونسلوں سے ‏ ‏ ‏ ہرگز نہیں گروگے، پر اور پرے اب تک

نکلے نہیں تمہارے، اس واسطے ابھی تک اونچے نہ اڑسکو گے، ہاں جب تمہارے بازو

اور پر درست ہوں گے، تو دن کی روشنی میں سیکھو گے تم بھی اڑنا، کرتے پھرو گے چیں چیں

اڑتے پھرو گے پھر، پھر؛ اے چھوٹے بچوں لیکن

کوا بری بلا ہے، اس سے خدا بچائے

اس نظم میں مصرع کا ایک نیا تصور سامنے آتا ہے جو اردو فارسی شاعری کے مصرع کے تصور سے بالکل مختلف ہے، لیکن جو انگریزی نظموں میں رائج ہے جس کو 'مصرع مسلسل' یا 'شعری اقتباس' کہا جاتا ہے۔ 'مصرع مسلسل' ایک ایسا مصرع ہے جس میں خیال بے روک ٹوک دوسرے مصرع تک پہنچ جاتا ہے اور شعر کے دونوں مصرعے الگ الگ اکائی نہیں رہتے۔ اردو شاعری میں یہ 'مصرع مسلسل' کے استعمال کی اولین مثال ہے۔ بعد میں شرر نے اپنے منظوم ڈراموں اور نادر کاکوروی نے اپنے ترجموں اور عظمت اللہ خاں نے اپنی نظموں میں اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔

ابیات : مولانا اسماعیل میرٹھی نے ہیئت میں ایک اور نیا تجربہ کیا۔ انہوں نے مکمل خیال کو قطعے سے بھی چھوٹی ہیئت میں پیش کیا انہوں نے ایک مکمل خیال کو صرف دو مصرعوں میں مطلع کی صورت میں پیش کیا ان کی کلیات میں اس کو ابیات کا نام دیا گیا ہے اور اس کے عنوان بھی دیے گئے ہیں۔ ان کے متعدد ابیات ضرب المثل بن کر زبان زد خاص و عام ہیں۔

اچھی بات :

جو بات کہو صاف ہو ستھری ہو بھلی ہو

کڑوی نہ ہو، کھٹی نہ ہو، مصری کی ڈلی ہو

راستی :

راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ خطرہ نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں

بری صحبت سے بچو :

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام برا
بد نہ بنے تو بد کہلائے بد اچھا بدنام برا

رباعیات : رباعی اردو نظم کی ایک پرانی صنف ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی کلیات میں ۸۰ رباعیات شامل ہیں جن کی بحروں میں وسعت اور موضوعات میں تنوع ہے۔ زیادہ تر رباعیاں 'وحدت الوجود' اور 'اخلاق و کردار' کے عنوان کے احاطہ میں آتی ہیں۔ اردو شاعری میں رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع مردّف ہوتا ہے جبکہ تیسرا غیر مردّف۔ مولانا نے اس صنف میں بھی ہیئت کے تجربے کئے ہیں۔ ان کے یہاں تین طرح کی رباعیات ملتی ہیں :

(۱) مردّف رباعیاں (۲) چہار قوافی رباعیاں اور (۳) سہ قوافی رباعیاں۔

انسان مظہر الالٰہی ہے

کرتا ہوں سدا اپنی مثالیں تبدیل طوفاں میں تھا نوح تو آتش میں خلیل
فی الحال ہوں ظاہر میں اگر اسماعیل ہوں عالم باطن میں وہی رب جلیل

[مردّف]

لا موجود الّا اللہ

ساقی و جام و شراب و پیمانہ کیا | شمع و گل و عندلیب و پروانہ کیا
نیک و بدو خانقاہ و میخانہ کیا | ہے راہ یگانگی میں بیگانہ کیا

[چہار قوافی]

حاصل کتاب تحصیل علم

چوپائے کی طرح تو نہ کتابوں سے لد | حاصل ہے کتاب کا فقط علم و خرد
کیڑوں نے ہزار ہا کتابیں کھالیں | پائی نہ مگر کبھی فضیلت کی سند

[سہ قوافی]

مندرجہ بالا حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا اسماعیل میرٹھی نظم معرّیٰ اور مختلف ہیئتی تجربات کی روشنی میں یقیناً ایک تاریخ ساز اور بڑے نظم گو شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ انہی کے نقشِ پا پر چل کر حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند و جدید شعرا نے اردو نظم معرّیٰ اور نثری نظم کو رفعتیں عطا کیں۔ یقیناً اردو نظم مولانا اسماعیل میرٹھی کے احسانات سے گراں بار ہے۔

روایتی شاعری

مولانا نے روایتی شاعری میں کوئی تاریخ ساز کا نامہ سرانجام نہیں دیا اس لئے یہاں صرف اس کا مختصراً جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

غزل: مولانا اسماعیل میرٹھی نے اصلاح سخن کے لئے مرزا غالب کا انتخاب کیا تھا ان کی غزلوں میں دو تصورات واضح ہیں جن سے مل کر ان کی غزلوں کی فضا نکھرتی ہے

(۱)تصوف اور(۲) رومان

(۱)تصوف :

اٹھے تیری نقاب تو اٹھ جائے ایک بار | سب تفرقہ یہ روز و شب وصبح و شام کا
ذہن سے جب کہ اشارہ ہو خودنمائی کا | عجب کہ بندہ نہ دعوہ کرے خدائی کا
بزم ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں | ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں
بتلا دیا ہے راہنما نے مجھے پتہ | دنیا بھی اک مقام تیری رہ گزر میں ہے

(۲)رومان :

ہے تو یہ اغیار سے خطاب مگر | میری ہر بات کا جواب بھی ہے
میرے سوا حریف ستم کوئی بھی نہ تھا | اب مہربان ہو گئے یہ کیا غضب ہوا
مہربانی بھی تو کچھ عیب نہیں | دشمنی شرط محبت ہی سہی

نفسیاتی نکتہ:

کبھی تقصیر جس نے کی ہی نہیں | ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں

ان کی غزل محض روایتی غزل ہے جیسے ان کے دور میں متعدد شعراء کہہ رہے تھے اس لئے جلد ہی وہ غزل سے منحرف ہو گئے۔ اس کی وجہ ملاحظہ فرمائے۔

مشاعرہ ہو تو لڑتے ہیں جیسے ٹینی مرغ | لہو لہان ہے پنجے شکستہ ہے منقار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ | کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
نہ جس سے طبع کو تفریح ہو نہ دل کو خوشی | غزل ہے یا کوئی ہذیان ہے بوقت بخار

قصائد : مولانا کی کلیات میں قصائد بھی موجود ہیں۔ قصیدہ اہل عرب

کی دین ہے۔ عربی قصیدوں کے موضوعات بیشتر مفاخرت اور مبارزت پر مشتمل ہو تے تھے۔ عربی سے اس صنفِ سخن کو اہل فارس نے اپنایا اور اس میں مدح کے عنصر کو شامل کیا اور پھر ایک وقت آیا کہ فارسی قصیدہ مدحیہ شاعری تک محدود ہو گیا۔ اہل فارس نے قصیدہ کی تصنیف و ترتیب میں بعض اجزاء کی پابندی کی اور ان کے اجزائے ترکیبی کو بھی انہوں نے ایک مستقل صورت عطا کی۔ چنانچہ فارسی قصیدوں میں تشبیب، گریز، مدح، دعا، اور خاتمہ اہم عناصر تسلیم کئے گئے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے اردو قصیدہ نگاری میں سوؔدا کی روایت کو پھر تازہ کیا اور سوؔدا کی روایت قصیدہ نگاری سے انحراف بھی کیا۔ یہ جداگانہ شاہ راہ ہمیں اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ ہم اس کو مولانا کا امتیازی وصف قرار دے سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں میں روایتی اجزائے ترکیبی کی پابندی کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے کئی قصیدوں سے تشبیب جیسے ضروری عنصر کو خارج کر دیا ہے۔ مولانا کے قصائد میں جریدۂ عبرت، 'نوائے زمستاں'، 'خدائے لشکر'، 'جاڑا اور گرمی'، 'خشک سالی'، 'اختلاف رائے'، 'عالم مشہود' 'اعتراف عنایت' اور 'خزینہ علم' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے آٹھ قصائد مدحیہ طور پر بھی کہے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) احساسات قلبی (۲) درِ بے بہا (۳) تہنیت جشن جوبلی حضور ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند، دام اقبالہ (۴) تہنیت سالگرہ، حضور ملکہ معظمہ، قیصر ہند، دام اقبالہ (۵) نوید مقدم شاہی (۶) جشن تاج پوشی (۷) تہنیت سالگرہ (۸) جشن

ملکۂ وکٹوریہ آنجہانی۔

قصائد میں انھوں نے روایت سے روگردانی کی لیکن ان کی مساعی اس صنف میں کسی تاریخ ساز اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

قطعات : کلیات اسماعیل میں قطعات بھی درج ہیں، جن کی تعداد کافی ہے ۔ لیکن کہیں کہیں نظموں کو قطعات اور قطعات کو نظموں کے عنوان کے تحت رکھا گیا ہے۔ ہم ان کے قطعات کو تین موضوعات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں (۱) شاعرانہ قطعات (۲) موضوعاتی قطعات اور (۳) تاریخی قطعات

قطعات میں دو یا دو سے زائد اشعار پائے جاتے ہیں مولانا کے قطعات دو شعر کے بھی ہیں اور متعدد اشعار کے بھی۔ مولانا نے اس صنف میں بھی ہیئت کی پابندی نہیں کی بلکہ جگہ جگہ روایت سے انحراف ہی کیا ہے۔

آزادی غنیمت ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر وہ ہے خوف وذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور دوسرے شعر میں بھی دو مصرعے ہم قافیہ ہیں مگر دوسرے شعر میں 'ہو' ردیف بھی شامل ہے۔

طلب خیر میں قناعد سے حرص بہتر ہے

جو طلب خیر میں قانع ہوا اپنا ترقی کا وہ مانع ہوا
ایسی قناعت سے طمع خوب ہے حرص ہی اس راہ میں محبوب ہے

پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ردیف 'ہوا' ہے مگر دوسرے شعر میں قافیہ بدل گیا ہے، اگر چہ دونوں مصرعوں میں ہم قافیہ الفاظ ہیں مگر 'ہے' ردیف پہلے شعر کی ردیف سے مختلف ہے۔

همت

گھڑ دوڑ میں کودائی کی بازی تھی ایک دن تازی پہ کوئی ترکی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا سو رہ گیا ادھر جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

دونوں شعروں میں ردیف 'تھا' کی پابندی ہے اور مصرعے دوم ہم قافیہ ہیں لیکن مصرع اول اور مصرع سوم میں قافیہ نہیں ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے اپنے قطعات میں کسی ہیئت کی پابندی نہیں کی بلکہ مختلف قطعات میں مختلف تجربات کئے ہیں۔

بچوں کا ادب

کسی بچہ کی تربیت اور ذہنی نشو ونما کا پہلا مکتب آغوش مادر ہے۔ اس کے بعد وہ شفیق استاد کے سایہ تربیت میں پروان چڑھتا ہے۔ مطالعہ کا عمل اور اس کے لوازمات بچے کی شخصیت کو نکھارتے اور بھرپور بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان دنوں بچوں کے لئے مفید اور دلچسپ کتابیں تحریر کرنے کے کام کے اولین مراکز لاہور اور میرٹھ تھے۔ سب سے پہلے جس دور اندیش شخص نے اس طرف توجہ کی وہ سر سید احمد خاں تھے۔ انہوں نے مولوی ذکاء اللہ کے علم اور تجربے اور ذہانت سے فائدہ اٹھایا اور بچوں کے لئے کتابیں شائع کرائیں۔ لیکن درسی کتابوں کی تالیف وطباعت کے سلسلے میں

مولانا محمد حسین آزاد کو اوّلیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر اسلم قریشی لکھتے ہیں:

''آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز درسی کتابوں ہی سے ہوا تھا۔ ادبی تصانیف کے وجود میں آنے سے پہلے ان کی درسی کتابیں قبول عام کا خلعت حاصل کر چکی تھیں۔''

[اسماعیل حیات اور خدمات: از ڈاکٹر سیفی پریمی]

آزاد نے اردو کی کتابوں کے دو سلسلے مرتب کئے تھے:

(۱) قدیم: جو اردو کی پہلی اور دوسری کتاب پر مشتمل ہے۔

(۲) جدید: یہ سلسلہ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، اور چوتھی کتاب پر مشتمل ہے۔

شمالی ہندوستان کا دوسرا اہم مرکز جہاں بچوں کی درسی کتابوں کے لئے کام کیا گیا وہ میرٹھ ہے۔ مولانا آزاد کے بعد مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لئے درسی کتابیں مرتب و تالیف کیں۔ ان کی یہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) **اردو زبان کا قاعدہ:** یہ کتاب نہایت مفید و مقبول ثابت ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء تک یہ ۱۲۵ دفعہ شائع کی گئی۔ اس کا حلقہء فیض وسیع تھا۔ سر رشتہء تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ اور صوبہ جات بہار و اڑیسہ کے ڈائرکٹروں کی تجویز کے مطابق اس کی تالیف و اشاعت عمل میں آئی۔ اس قاعدہ کے ذریعہ بچوں کو حروف تہجی اور اعراب سکھائے گئے۔ پھر چھوٹے چھوٹے الفاظ بنانے سکھائے گئے اور بعد ازاں چھوٹے چھوٹے جملے بنانے کی مشق بھی کرائی گئی۔ یہ قاعدہ بیس صفحات پر مشتمل تھا۔

(۲) **اردو کی پہلی کتاب:** مولانا نے اردو کی پہلی کتاب سر رشتہ تعلیم

ممالک متحدہ آگرا اور اودھ اور صوبہ جات بہار و اڑیسہ کی تجویز پر مرتب کی تھی۔ یہ کتاب ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء میں جب یہ کتاب نول کشور پریس لکھنو سے چھپی تو اس سے قبل اس کے بیانوے (۹۲) ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اس کتاب میں ۱۲۳ اسباق شامل کیے گئے تھے۔

(۳) اردو کی دوسری کتاب : اس کتاب میں نظموں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے، جس میں خود مولف کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ مختصر کہانیاں کتاب میں شامل کی گئیں۔ جانوروں کی کہانیوں کے ذریعہ بچوں کو نصیحتیں کی گئی ہیں۔ اس کتاب کی بعض نظمیں انگریزی کہانیوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ بعض کہانیاں فارسی سے لی گئیں ہیں۔ رخصت کی عرضی لکھنا سکھایا گیا ہے اور نظیر اکبرابادی کی نظم ''بنجارہ'' اور رنگین دہلوی کی ''حریص بلی'' شامل کر کے بچوں کو اردو کے قدیم شہ پاروں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ مولف کی نظم ''ہماری گائے'' بھی اس میں شامل ہے، جو قومی یک جہتی کی نادر مثال ہے۔

(۴) اردو کی تیسری کتاب : اس کتاب میں مولانا نے انسان اور جدید علوم کو خاصی اہمیت دی ہے اس لئے اس کا مواد زیادہ تر انسانی اقدار اور سائنسی نکتہ نظر کا مظہر ہے۔ اس میں پٹواری کی نوکری کے لیے ایک عرضی کا مضمون بھی دیا گیا ہے۔ بچوں کو خط لکھنے کا طریقہ بھی سکھایا گیا ہے۔ تاریخی حالات میں راجہ بکرماجیت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ کئی اچھی نظمیں شامل کتاب ہیں۔ زراعت کے مستقل کاموں کو بھی بچوں کو سمجھایا گیا ہے۔

(۵) اردو کی چوتھی کتاب : اس کتاب میں تاریخی قصص کا اضافہ ہے۔اس لئے کہ اس عمر کے بچے تاریخی کرداروں کو پسند و ناپسند کرنے کا شعور رکھتے ہیں۔ان کی شخصیت بننے اور نکھرنے میں یہ کردار اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔''سیتا جی''''اہلیہ بائی''اور''نور جہاں''کے حالات شامل کر کے صنف نازک کے دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس کتاب میں مثبت اخلاقی قدروں کے ساتھ فطری مناظر سے لطف اندوز ہونے کا اہتمام کیا گیا ہے۔مثلاً 'گرمی کا موسم'، 'صبح کی آمد'، 'آسمان اور ستارے'، 'تاروں بھری رات'، 'جنگل اور چاندنی رات' وغیرہ اس کی نظمیں کافی دلچسپ ہیں اور بچوں کو حسنِ فطرت کی طرف مائل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں دنیا کے دوسرے ملکوں سے بھی کہانی اور مضمون کے ذریعہ بچوں کو روشناس کرایا گیا ہے۔'آرائش محفل' اور 'مثنوی سحر البیان' کے کچھ ٹکڑے بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔جدید سائنسی علوم سے متعلق مضامین جیسے 'دمدار ستارے'، 'چھاپا خانہ'، 'کوئلے کی کان'، 'بخاری یا دخانی کشتی' کتاب میں شامل کر کے بچوں کو جدید سائنس کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہے۔نظموں میں وطنیت کا عنصر غالب ہے۔مثلاً 'آم کی تعریف'، 'ہندوستان کے پھول'، 'بنائے قلعہ آگرہ'، 'کوہ ہمالہ' وغیرہ مولف کی اپنی نظمیں بھی کافی تعداد میں شامل ہیں۔ذوقؔ و رندؔ کی غزلیں اور غالبؔ کا قطعہ شامل کر کے شعری ادب سے بھی بچوں کو آگاہ کرایا گیا ہے۔

(۶) اردو کی پانچویں کتاب : اس کتاب میں نظم کا حصہ غالب ہے۔مثنوی 'سحر البیان'، مثنوی 'گلزار نسیم'، میرؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ وغیرہ کے شہ پارے داخل

نصاب ہیں۔اردو کی مقبول صنف غزل بھی اس میں شامل ہے۔اس کتاب میں مشکل
الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔مولانا نے سرجان لارنس،ارسطو،شارپ، کے حالات
لکھ کر بچوں کو عام بہبود کے لئے کام کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔حکومت،آزادی اور غلامی
کے تصورات سے بچوں کو واقفیت کرائی گئی ہے۔اس سلسلے میں 'غلامی کا انسداد' ایک اہم
مضمون ہے جس میں ۱۸۳۴ء میں شارپ کی جدوجہد سے غلامی کی رسم ختم ہونے کا
بیان ہے ۔ اس کتاب میں ٹھوس علمی مضامین بھی شامل ہیں مثلاً 'مبادلہ تحقیق'،
'حکومت'،'ستارے'،'کہکشاں'،'ہوا اور آسماں'،'حواس خمسہ' وغیرہ۔

توہم پرستی کا اثر بچوں کے ذہن سے دور کرنے کے لئے 'بکری کا بھوت' اور
'باجے کا بھوت' دو اچھے مضامین شامل ہیں۔آخر میں زراعت سے متعلق مضمون بھی
کتاب کا اہم حصہ ہے۔

مولوی اسماعیل کی ان درسی کتابوں نے ایک لمبے عرصے تک نہ صرف بچوں کو
تعلیم دی بلکہ ان کی تربیت کرنے میں بھی ایک کلیدی رول ادا کیا۔

دیگر نثری کاوشیں :

(۱) توزک اردو ۱۸۹۴ء۔آگرہ کے قیام کے دوران مولانا نے اردو مڈل
کلاس کے طلباء کے لیے ایک انتخاب کیا تھا جو "توزک اردو" کے نام سے چھپا۔یہ
کتاب کئی برس تک نصاب میں داخل رہی کچھ دنوں بعد مولانا نے کتاب کا بڑا ایڈیشن
مرتب کیا جو ہائی اسکول کے لئے تھا اور برسوں تک نویں اور دسویں جماعتوں میں اسے
پڑھایا گیا۔اس کتاب کو نثر و نظم دونوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔نثر کے لئے ۲۰۸ اور نظم کے

لئے ۱۰۰ صفحات رکھے گئے تھے۔

(۲) اردو کورس برائے نارمل اسکول ۱۸۹۷ء۔ یہ انتخاب نارمل اسکول کی دوسرے سال کی جماعت کے لئے کیا گیا تھا یہ کتاب نول کشور پریس لکھنو کی فرمائش پر تالیف کی گئی تھی۔

(۳) کمک اردو اور ادیب: ۱۹۰۹ء میں مولانا لکھنو تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے دو ادبی انتخاب تالیف کئے یہ انتخاب کتابی شکل میں شائع ہوئے ان کی افادیت کے پیش نظر ہی ان کو شامل نصاب کیا گیا۔ یہ کتابیں شہری اور دیہی مدارس کی پانچویں اور چھٹی جماعتوں کے لئے برسوں داخل کورس رہیں۔

(۴) سفینہ اردو۔ یہ کتاب اردو انتخاب کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ انگریزی اسکول کے درجہ ہفتم اور ہشتم کے سرکاری نصاب میں شامل تھی۔

(۵) سواد اردو۔ (۱۹۱۴ء) ہندوستانی زبان کی تیسری اور چوتھی جماعت کے طلبہ کے لئے یہ کتاب سررشتہ تعلیم یوپی کی خواہش پر تالیف کی گئی۔

(۶) قواعد اردو حصہ اول و دوم۔ ۱۸۹۴ء میں عربی گرامر کی تقلید سے بچ کر مولانا نے یہ رسالے ترتیب دئے تھے، جو پرائمری اور اپر پرائمری کے طلباء کے لئے مرتب کئے گئے تھے۔

(۷) ترجمان فارسی۔ یہ کتاب ۱۸۹۸ء میں سرکاری مدارس کے مبتدی طلباء کے لئے مرتب کی گئی تھی۔ اس میں اردو سے فارسی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کے قاعدے بیان کئے گئے اور مہارت حاصل کرنے کے لئے قواعد سے متعلق مشقیں

بھی شامل تھیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لمبے عرصے تک کئی نسلیں اپنی تعلیم و تربیت کے لئے مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کی مرہون منت رہی ہیں۔ انہیں کے اسباق سے کئی نسلوں نے نہ صرف علم کی روشنی حاصل کی بلکہ اپنا مستقبل بہتر بنایا اور اپنے قرب و جوار کی دنیا کو بھی بہتر بنانے میں مدد دی۔ ہم مولانا اسماعیل میرٹھی کی ان خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں :

"تعلیمی نقطۂ نظر سے باضابطہ معیاری کوشش مولوی محمد اسماعیل کا حصہ تھی۔ 'سعدی ہند' اور 'بچوں کے اسماعیل' دونوں لقب ان کے لئے مناسب تھے۔"

[اردو کی کہانی: مئی ۱۹۶۲ء ناشر سید انصار حسین لکھنؤ ص ۴۳]

ڈاکٹر عبدالوحید کی رائے ہے:

"مولانا اسماعیل نے جس انہماک اور بچوں کے نفسیاتی مطالعہ کے بعد یہ کتابیں لکھیں ہیں وہ مولانا آزاد کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔"

[جدید شعرائے اردو: عبدالوحید۔ لاہور ص: ۳۶]

باب پنجم

اختتامیہ

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی ایک تاریخ ساز ادبی شخصیت ہیں اور تنقید کی یہ ستم ظریفی رہی ہے کہ اس نے مولانا اسماعیل کو محض ایک بچوں کا شاعر سمجھ کر پیش کیا جب کہ بقول گوپی چند نارنگ:

> ''بچوں کا ادب'' اسماعیل میرٹھی کی ادبی شخصیت کا محض ایک رخ ہے ان کا شمار جدید نظم کے ہئیتی بنیاد گزاروں میں بھی ہونا چاہیے وہ صرف 'عجیب چڑیا'، 'گھوڑا'، 'اونٹ'، 'طمع کی انگوٹھی'، 'محنت سے راحت' اور 'ہر کام میں کمال اچھا ہے' کے ہی شاعر نہیں تھے انہوں نے 'مناقشہ ہوا و آفتاب'، 'مکالمہ سیف و قلم'، 'باد مراد'، 'شفق'، 'تاروں بھری رات' اور 'آثار سلف'، جیسی نظمیں بھی لکھیں ہیں۔''

[پیش لفظ: اسماعیل حیات اور خدمات از ڈاکٹر سیفی پریمی۔ ص:٦]

مولانا اسماعیل ایک جامع صفات انسان تھے اور ان کی ادبی شخصیت خاصی پہلو دار ہے۔ ان کی کئی صفتیں ہیں اور اردو ادب میں ان کی خدمات سے پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ جدید نظم کے لئے انہوں نے مولانا الطاف حسین حالؔی سے بہت قبل قلق میرٹھی کے تراجم سے متاثر ہو کر انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کر کے انگریزی سے ماخوذ اور طبع زاد نظمیں کہہ کر جدید نظم کی شاہ راہ پر نہ صرف اپنے قدم ثبت کئے بلکہ اپنے پس رفتگاں کے لئے مشعل راہ بھی بنے۔ وہ نظم جدید کی تحریک کے مقتدی نہ تھے، امام تھے۔ نیاز فتحپوری نے کچھ اس انداز سے کہا ہے :

''ان کی نظمیں دبستانی حیثیت رکھتی ہیں یہ اور حالی پہلے شخص تھے جو اردو کے قدیم رنگ کو بدل کر اسے مغربی انداز پر لے گئے۔''

[خندہ گل: بہ اہتمام نیاز فتحپوری۔ ص:۳۲]

برہان دہلی فروری ۱۹۴۰ء میں کہا گیا ہے :

''وہ نثر سے زیادہ نظم میں ایک مخصوص طرز کے موجد تھے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو نظم میں نیچرل شاعری کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ایجاد کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔''

مولانا عبدالباری کی رائے ملاحظہ ہو:

''حالؔی مرحوم اور مولانا مذکور کا ایک رنگ ہے بلکہ بعض باتوں میں آپ حالؔی مرحوم سے پیش پیش ہیں۔''

[خندۂ گل بہ اہتمام نیاز فتح پوری]

پروفیسر حامد حسین قادری ''دبستان تاریخ اردو'' میں رقمطراز ہیں:

''حالی و آزاد کے ہم عصر انیسویں صدی کے بہترین شاعر مولوی محمد اسماعیل میرٹھی ہیں۔ جن کی نظمیں محاسن شاعری میں آزاد و حالی دونوں سے بہتر ہیں۔''

[داستان تاریخ اردو: حامد حسین قادری۔ ص: ۳۸۸]

جگر بریلوی کا یہ کہنا ہے کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ روانی میں مولانا کی بعض نظمیں مثنوی سحر البیان سے بھی آگے نظر آتی ہیں اور جس سہل ممتنع کو غالب سے خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے مولانا اس کے بادشاہ تھے۔''

[روہیل کھنڈ اخبار، بریلی۔ ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء]

محمد حسین آزاد کو کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی حاصل ہوئی اور آزاد اور ان کے رفقاء نے شعوری طور پر جدید نظم کو ایک اعلیٰ مقام عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بد قسمتی یہ ہے کہ قلق میرٹھی اور مولانا اسماعیل میرٹھی کی سرپرستی مسٹر کیمسن نے اسی طرح کی ہوتی جس طرح کرنل ہالرائیڈ نے محمد حسین زاد کی کی تھی تو انجمن پنجاب سے دس سال قبل ہی میرٹھ سے جدید نظم کی تحریک کا باقاعدہ اور شعوری طور پر آغاز ہوگیا ہوتا لیکن یہ بات تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ انگریزی نظم کی خوبیوں کا پہلا احساس میرٹھ کے شعراء کو ہوا اور اردو نظم میں ان خوبیوں کو سمونے اور انہیں پھیلانے کا کام میرٹھ میں شروع ہوا۔ اس کے چھ سات برس بعد پنجاب میں اردو نظم کی تحریک کا

باقاعدہ آغاز ہوا۔

مولانا نے نہ صرف رباعی، قصیدے، اور قطعات کی ہیئت میں تبدیلیاں کیں بلکہ باقاعدہ طور پر نظم کی ہیئت میں تبدیلی کر کے نظم معریٰ کا آغاز کیا، جس کا اعتراف کئی اہم اور ممتاز نقاد کر چکے ہیں۔ مولانا اسماعیل میرٹھی ادب کے اس دور میں آئے جب نہ صرف مغربی تہذیب ہندوستانی دماغوں پر اپنے قدم ثبت کر رہی تھی بلکہ دنیائے شعروادب نے بھی مغربی شعری و ادبی خیالات کی تازہ ہوا کے لئے اپنی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ مولانا نے اس مغربی اثر کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ ہماری زبان کے مزاج و کردار کے ہم آہنگ کیا کہ لگا یہ کہ ہماری نظم کا ہی ایک حصہ ہے۔ کوئی انگریزی کی پیوندکاری نہیں۔ ان کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہر خیال، ہر جذبہ شعر کی تہہ میں بھی اپنے معنی تلاش کر لیتا ہے اور یہ کیا کم ہے کہ شعوری طور پر انہوں نے شاعری کو حسن و عشق کے مضامین سے بلندتر مضامین عطا کیے۔

انہوں نے اردو نصابی کتب کی تدوین و تربیت کے مقدس فریضے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ انجام دیا اور اپنی نصابی کتابوں کے ذریعہ نئی ادبی اور سماجی آگہی کو نئی نسل کے شعور کا جز بنا دیا۔ انہوں نے کئی نسلوں تک ادبی مذاق کی آبیاری کی اور نئی نسلوں کی تربیت کرنے اور ان کو ایک اچھا انسان بننے میں ان کی معاونت کی۔

لہٰذا اہل میرٹھ ہی نہیں بلکہ پوری ادبی دنیا ان تینوں شعرا کی گراں خدمات اور شاعری میں ان کے قابل قدر اضافے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی نثر و نظم سے ایک ایسا جہان روشن ہے جس سے لوگ ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہیں گے۔

کتابیات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف / مرتب	مطبوعہ
	قلق میرٹھی (حیات اور کارنامے)	ڈاکٹر جلال انجم	فیضی پبلیکیشن، دہلی، 1987
	حیات اسماعیل	ڈاکٹر سیفی پریمی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، 1976
	حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی (اردو شاعرات کا اولین تذکرہ نگار)	ڈاکٹر راحت ابرار	بھارت آفسیٹ پریس دہلی، 1999
	حیات وکلیات: اسماعیل میرٹھی	محمد اسلم سیفی	دیال پرنٹنگ پریس، دہلی، 1939
	رنج میرٹھی: حیات، شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر مقصود حسین	لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1991
	تلامذہ غالب	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، 1984
	تذکرہ شعرائے میرٹھ	نور احمد میرٹھی	
	آب حیات	محمد حسین آزاد	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1993
	اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مجلس ترقی ادب، لاہور
10	سالنامہ نقوش لاہور نمبر۔ ادبی تحریکیں	شہرت بخاری	
11	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید	ادارہ فروغ اردو، لاہور
12	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ
13	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	ڈاکٹر عنوان چشتی	
14	تخلیق وتنقید	ڈاکٹر اے۔ خاں شاہین	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1986

15	انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	حسن الدین احمد	ولا اکیڈمی، حیدرآباد، 1981
16	اردو اسالیب نثر	ڈاکٹر اسلم خاں شاہین	چغتائی پبلشرز، میرٹھ 1985
17	بہارستانِ ناز (طبع اول)	فصیح الدین رنج میرٹھی	دار العلوم میرٹھ 1864
18	بہارستانِ ناز (طبع دوم)	فصیح الدین رنج میرٹھی	دار العلوم میرٹھ 1869
19	بہارستانِ ناز (طبع سوم)	فصیح الدین رنج میرٹھی	مطبع عشقی، میرٹھ 1882
20	بہارستانِ ناز	مرتبہ خلیل داؤدی	مجلس ترقی ادب، لاہور 1965
21	تذکرہ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1985
22	تذکرہ گلشن ہند	میرزا لطف علی	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1986
23	تذکرہ شمیم سخن	عبدالحئی صفا بدایونی	نول کشور، لکھنؤ، 1891
24	تذکرہ نسوان ہند	فصیح الدین بلخی	شمسی پریس، پٹنہ، 1956
25	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1985
26	جواہر القرآن (مترجم)	مولانا شاہ رفیع الدین	زیب مجتبائی، 1288(H.)
27	تذکرہ چمن انداز	درگا پرشاد نادر	
28	حیات جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	ترقی اردو بیورو، دہلی، 1982
29	دبستان میرٹھ	مشتاق شارق میرٹھی	مخطوطہ

رسائل واخبارات

30	دیوان شور (چہارم)	جارج پیش شور	پولس پریس، میرٹھ 1888
31	رسالہ تذکرات گارساں دتاسی	مرتبہ ڈاکٹر تنویر علوی	دلی مجلس، دہلی 1968
33	سیر المصنفین	ڈاکٹر اسلم خاں شاہین	اشاعت ادب گھر، میرٹھ 1976
34	عود ہندی	مرزا غالب	مطبع نول کشور، لکھنؤ، 1925

35	کلیاتِ فن	کلب علی خاں فائق	مطبع عالیہ، لاہور، 1925
36	تذکرہ گلشنِ بے خار	مصطفےٰ خاں شیفتہ	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1982
37	گلشنِ نعت (طبع دوم)	فصیح الدین رنج میرٹھی	فخر المطابع، میرٹھ، 1889
38	گارساں دتاسی	پروفیسر ثریا حسین	یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1984
39	مخزن الصفاحت	فصیح الدین رنج میرٹھی	مطبع ہاشمی پریس، 1307 ہجری
40	مقالاتِ حالؔی	الطاف حسین حالؔی	جامعہ پریس، دہلی، 1914
41	مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1981
42	نعتیہ شاعری کا ارتقاء	ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد	فائن آرٹ ورکس، الٰہ آباد، 1988
43	یادگارِ غالبؔ	الطاف حسین حالؔی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، 1991
44	اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں	شمیم احمد	انڈیا بک امپوریم، بھوپال، 1981
45	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	ڈاکٹر محمد حسن	ادارہ تصنیف، علی گڑھ، 1964
46	کلیاتِ اردوئے قلق	حکیم مولا قلق	مطبع انصار، دہلی، 1883
47	ترجمہ کا فن اور روایت	مرتب ڈاکٹر قمر رئیس	تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1976
48	مسدسِ حالؔی	الطاف حسین حالی	لکھنؤ، 1919
49	نئے ادبی رجحانات	سید اعجاز حسین	الٰہ آباد، 1942
50	جواہرِ منظوم	غلام مولیٰ قلق	1867
51	نگار قلق میرٹھی	تمکین کاظمی	لکھنؤ، بمبئی، 1953
52	نگار: قلق میرٹھی	سید محمد فاروق	کراچی، جولائی، 1964
53	نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	کراچی، جولائی، 1984

54	تہذیب الاخلاق جلد۳، نمبر۱	سرسید احمد خاں	علی گڑھ، 1289 ہجری
55	علی گڑھ میگزین (علی گڑھ تحریک نمبر۵۳)		علی گڑھ، 1953
56	اردوئے معلی		علی گڑھ فروری، 1911
57	اردوئے معلی (علی گڑھ)		دہلی، 1927
58	اردوئے معلی جلد۵، نمبر۹		کانپور جنوری۔فروری، 1925
59	اردوئے معلی		کانپور فروری۔مارچ، 1930
60	اردوئے معلی (قدیم اردو نمبر)	شعبہء اردو، ڈی یو	دہلی، 1968
61	حوادث: قلق میرٹھی	عبدالقدوس	میرٹھ فروری، 1980
62	زمانہ قلق	محمد یحییٰ تنہا	کانپور نومبر، 1935

تاریخی و ادبی خدمات کا مختصر مگر جامع انداز میں معروضی جائزہ پیش کر کے اس کام کو انفرادیت بخشی ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ کتاب کے جائزے میں بڑی حد تک انسلاک پایا جاتا ہے اور اس اعتبار سے نئی تلاش و جستجو کا جواز بھی پیدا ہوتا ہے۔ مصنف نے مذکورہ شاعروں کے شعری و فکری تجزیات و امتیازات کے تعین میں توازن، نثری سلاست اور مواد کی قطعیت کو برقرار رکھتے ہوئے ادبی معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق صدف

مصنفہ کا تعارف

نام : شاداب علیم

نام والد : جناب سید علیم الدین

نام والدہ : محترمہ حلیمہ خاتون

تاریخ پیدائش: یکم جنوری 1960

جائے پیدائش: قصبہ پھلاودہ، ضلع میرٹھ (یوپی)

شریکِ حیات: جناب سید اطہر الدین

تعلیم : ایم اے اردو، 2004 (گولڈ میڈل)

: ایم فل اردو (جاری)

شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

تصنیف : نظم جدید کی تثلیث

زیرِ طبع : اسماعیل میرٹھی کا فکر و فن

(نظمیہ شاعری کے حوالے سے)

ادارت : ہماری آواز (ششماہی) 2003-04

رہائش : 302/20، نادر علی بلڈنگ،

دہلی روڈ، میرٹھ، (یوپی) فون: 0121-2423980

شاداب علیم

مجھے بے حد مسرت ہے کہ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کی طالبہ شاداب علیم کی کتاب "نظم جدید کی تثلیث" منظر عام پر آ رہی ہے۔ جس میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی زیر نگرانی مقالہ نگار نے میرٹھ کی تین بلند پایہ ادبی شخصیات قلق، رنج اور اسماعیل میرٹھی کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ ہر چند کہ ان میں سے ہر ایک پر کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن ایک عام طالب علم کے لئے یک مشت تینوں کی خدمات کا جائزہ ایک ہی کتاب میں یکجا کر دینے سے جو افادی پہلو سامنے آتے ہیں اہل نظر کے لئے ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس دانش گاہ کی ایک ایم اے کی طالبہ کی علمی استعداد اور تنقیدی بصیرت اس منزل پر ہے جو عموماً پی ایچ ڈی اسکالروں میں بھی کم پائی جاتی ہے۔

میں اس کارنامے کے لئے شاداب علیم کے ساتھ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو بھی مبارکباد دیتا ہوں۔

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے۔